دیکھ لیا امریکہ

علی سفیان آفاقی

MAQBOOL ACADEMY
مقبول اکیڈمی

فہرست

امریکی غریب	۲۵
ٹی وی اور معاشرہ	۳۰
بن باسی !	۳۴
امریکہ میں مذہب	۴۰
مصنوعات اور حب الوطنی	۴۵
نسلی تعصب	۵۲
ایک پہلو یہ بھی ہے	۵۸
امریکی لکھ پتی	۶۷
سگ پرستی	۷۳
رشوت	۸۳
جنسی مسائل	۸۷
مذہب اور معاشرہ	۹۳
تلخ حقائق	۱۰۳
طلاقیں اور بچے	۱۱۵
اِدھر اُدھر کی	۱۲۰

ٹی وی اور مذہب	۱۲۹
سیاحت اور جسم فروشی	۱۳۵
اقتصادی مشکلات	۱۴۰
عہدے اور فائدے	۱۴۴
فلمیں	۱۵۰
ڈیک	۱۵۳
منشیات	۱۵۷
شادی، مغربی سٹائل	۱۶۳
امیر کناڈا کے غریب لوگ	۱۷۰
ٹورنٹو	۱۸۲
پڑھیے جو بیمار۔۔۔۔	۱۹۰
شکایتیں، حکایتیں !	۱۹۹
روحانیت کی تلاش میں !	۲۱۳

امریکہ ایک ایسا ملک ہے جسے مجموعۂ اضداد کہا جاسکتا ہے۔ اس کی خوبیاں بیان کی جائیں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جاتے ہیں۔ تعریف کرتے ہوتے زبان نہیں تھکتی۔ لیکن اگر برائیوں پر نظر ڈالی جاتے تو وہ بھی کم نہیں ہیں۔ امریکہ ہر لحاظ سے ساری دُنیا پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر ایجاد، ہر اچھی چیز کا آغاز امریکہ سے ہوتا ہے۔ اس کی کامیابیاں اَن گنت ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، فنونِ لطیفہ، معاشیات، صنعت و حرفت، سیاست ہر شعبے میں امریکہ ساری دُنیا کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ میں جو فیشن نکلتا ہے وہ دُنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ آہنی پردے کے ممالک بھی امریکی اثر و نفوذ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ امریکہ نے "کوکا کولا" کو رواج دیا اور آج دُنیا کے بیشتر ممالک میں چھوٹے بڑے سبھی لوگ اس کے عادی ہیں اور تو اور اب چین میں بھی کوکا کولا پہنچ گیا ہے۔ دوسری طرف منشیات اور جرائم کا آغاز بھی امریکہ ہی سے ہوتا ہے۔ "ہپی" نسل کو امریکہ نے دُنیا سے روشناس کرایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا ہپیوں سے بھر گئی۔ امریکہ سے نت نئے جرائم کا انداز دُنیا کے ہر ملک میں پہنچ جاتا ہے۔ امریکی طرزِ زندگی کی طرح امریکی جرائم بھی ہر جگہ پھیل چکے ہیں۔ ذرائع ابلاغ پر امریکہ شہنشاہی کرتا ہے۔ وہ اپنے اندازِ فکر کو اس انداز سے نشر کرتا ہے کہ ساری دنیا اس پر ایمان لے آتی ہے۔ امریکی لٹریچر نے ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ امریکی فلمیں دُنیا بھر کو دیوانہ بناتی رہی ہیں۔ جو اداکار یا اداکارہ امریکی فلموں میں آیا اور ذرائع

تشہیر میں جگہ پا گیا اسے ساری دنیا نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور اس کی حیثیت کو تسلیم کر لیا۔ کون سا ایسا شعبۂ زندگی ہے جس کے ذریعہ امریکہ نے اپنی چھاپ نہیں لگائی —— یہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ اگر امریکہ کو ہلکا سا نزلہ ہو جائے تو یورپ چھینکنے لگتا ہے اور باقی دُنیا نمونیا میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ صنعتوں اور کاروبار پر امریکہ کی اجارہ داری ہے۔ کھانے پینے کا سامان فراہم کرنے کے سلسلے میں بھی امریکہ پیش پیش ہے۔ وہ چاہے تو ساری دُنیا کے بھوکوں کے لیے خوراک فراہم کر سکتا ہے مگر وہ مصلحت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ "ضرورت مندوں" کو تھوڑی بہت امداد اور خوراک فراہم ضرور کرتا ہے مگر اس سے کہیں زیادہ سمندر میں پھینک دیتا ہے تاکہ اس کا تجارتی توازن قائم رہے۔ مختصر یہ کہ امریکہ ایک ملک نہیں، ایک سوچ ہے، ایک اندازِ فکر ہے، ایک بلائے ناگہانی ہے جس کے اثرات سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

فوجی اعتبار سے امریکہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ روس نے دوسری سُپر پاور کے طور پر توازن قائم کرنے کی کوشش میں اپنے سیاسی اور اقتصادی نظام کو تباہ کر لیا پھر بھی امریکہ کا ہم پلّہ نہ ہو سکا۔ دُنیا بھر میں کوئی بھی ملک امریکہ سے محفوظ نہیں ہے۔ وہ براہِ راست یا بلاواسطہ سب پر سایہ فگن رہتا ہے۔ امریکہ کی حیثیت ایک مدار جیسی ہے جس کے گرد ساری دُنیا چکر لگا رہی ہے۔ دُنیا کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ دُنیا میں مختلف اوقات میں مختلف قوتوں نے فرماں روائی کی ہے اور اسے زیروزبر کیا ہے۔ بڑی عظیم الشان سلطنتیں، بڑے قاہر و جابر سلطان اور حکمران اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گئے ہیں مگر انسانی تاریخ امریکہ کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ امریکی برتری بہت پُرانی ہے اور ہنوز اس میں کمی کے آثار نظر نہیں آتے۔ امریکی تہذیب کا دَور ابھی ختم نہیں ہُوا ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

مذکورہ بالا وجوہات کی بنا۔ پر نہ صرف دُنیا کے ہر گوشے میں رہنے والا ہر شخص امریکہ

کے نام اور مقام سے آشنا ہے بلکہ ان کی اکثریت امریکہ جانے کی خواہش مند ہے۔ جو لوگ وہاں جا کر بسنا نہیں چاہتے وہ کم از کم ایک بار اسے دیکھنے کی حسرت ضرور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دُنیا میں امریکی ویزا آفس پر سب سے زیادہ ہجوم نظر آتا ہے اور امریکی گرین کارڈ حاصل کرنے کی تمنا دُنیا کی بہت بڑی آبادی کے لیے ایک جاں فزا خواب بن چکی ہے۔ جیسے جیسے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں کے باہمی تفاوت میں اضافہ ہو رہا ہے، امریکہ کا رُخ کرنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ بلامبالغہ ہزاروں لاکھوں افراد غیر قانونی طور پر امریکہ کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قانونی طور پر جانے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ آخر یہ دیوانگی کس لیے ہے؟ وہ کون سی کشش ہے جو انسانوں کو امریکی سرزمین کی جانب کھینچتی ہے؟ ... وہ کون سا سحر ہے جس نے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو وارفتہ بنا رکھا ہے؟ ہر ایک کا رُخ ایک ہی سمت میں کیوں ہے؟ یہ جاننے کے لیے زیادہ تحقیق و تردّد کی ضرورت نہیں ہے۔ امریکہ کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، بیان کیا جا چکا ہے، فلموں کے ذریعے پیش کیا جا چکا ہے کہ امریکہ اب کوئی راز نہیں رہا۔ اس کے باوجود ہر کوئی خود اپنی آنکھوں سے امریکہ کو دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

مجھے گزشتہ سالوں میں یورپ اور دُنیا کے مختلف ممالک میں جانے کا موقعہ ملا۔ بعض ملکوں کا میں نے بار بار سفر کیا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء سے پہلے میرے دل میں کبھی امریکہ جانے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ مجھے یورپ ہی اچھا لگتا رہا۔ میں نے کبھی امریکہ جانے کا قصد نہیں کیا۔ پھر یوں ہوا کہ ۱۹۷۹ء میں لاہور کی ایک نجی دعوت میں، میری ملاقات امریکی ویزا آفیسر سے ہوئی۔ میزبان نے میرا تعارف کراتے ہوئے مذاق کے انداز میں ان سے کہا۔

"یہ صاحب دُنیا بھر میں گھوم آتے ہیں مگر امریکہ جانے کو تیار نہیں ہیں۔ خدا

جانے انھیں امریکہ سے کیا ضد ہے ؟"

کھانے کے دوران میں سب لوگ مختلف گوشوں میں تقسیم ہو کر گپ شپ میں مصروف ہو گئے تو ویزا افسر مسٹر ریمنڈ پیپٹر میرے نزدیک آئے اور سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگے۔

" اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو دریافت کروں کہ آپ کو امریکہ سے کیا شکایت ہے ؟ آپ میرے ملک کو ناپسند کیوں کرتے ہیں ؟"

مَیں نے کہا :

" ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میرے دوست فقرہ بازی کے ماہر ہیں۔ انھوں نے محض چھیڑنے کے لیے وہ بات کہی تھی۔"

" تو پھر آپ امریکہ کیوں نہیں گئے آج تک ؟" انھوں نے سوال کیا۔

مَیں نے کہا۔

" بس ایسے ہی۔ کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ شاید اس لیے بھی کہ امریکہ ایک دُور دراز مُلک ہے جس کے بارے میں مجھے زیادہ واقفیت بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سُنا ہے بہت مہنگا ملک ہے۔ پھر اتفاق سے وہاں میرے شناساؤں کی تعداد بھی بہت کم ہے جو مختلف دُور دراز ریاستوں میں بکھرے ہُوئے ہیں۔ میرا ایک بھی قریبی رشتے دار امریکہ میں نہیں رہتا ورنہ اب تک وہاں کا پھیرا بھی لگ جاتا۔"

وہ مُسکراتے اور بولے۔

" یقین کیجیے امریکہ یورپ کے مقابلے میں سستا ملک ہے بہت وسیع و عریض ملک ضرور ہے مگر ذرائع آمد و رفت میسّر ہیں۔ آپ بڑی آسانی سے گھوم پھر سکتے ہیں۔"

مَیں نے انھیں یقین دلایا کہ میں پہلی فُرصت میں امریکہ جا کر ان کی شکایت دُور کر

دوں گا۔

امریکہ سے جو لوگ آتے رہتے ہیں وہ عموماً دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو سیاحت یا تعلیم کے سلسلے میں وہاں جاتے ہیں اور مختصر قیام کے بعد واپس آجاتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو وہاں آباد ہو گئے ہیں اور کبھی کبھار موقعہ نکال کر اپنے عزیزوں سے ملاقات کرنے کی غرض سے چلے آتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کی زبان پر امریکہ کی تعریف و توصیف کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دوسری قسم کے لوگ عموماً وہاں کی دولت مندی اور خوشحالی کے ساتھ ساتھ زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ ضرور کہتے ہیں کہ " جناب، وہاں زندگی بہت سخت ہے۔ بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔" مگر ظاہر ہے کہ جب لوگ یہ سُنتے ہیں کہ ان کا دوست یا عزیز جو زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں ہے اور ذہانت و صلاحیت کے معاملے میں بھی صفر ہے، امریکہ جا کر عیش کر رہا ہے بہت بڑے شہر میں رہتا ہے۔ اس کا اپنا گھر ہے جو ائر کنڈیشنڈ ہے اور جس میں ہر طرف قالین بچھے ہوتے ہیں۔ اس کے پاس اپنی کار ہے بلکہ اس کے تمام اہلِ خانہ کے پاس اپنی اپنی کاریں ہیں، تو یہ معلومات ہر ایک کو اُکساتی ہیں اور دل میں امریکہ جانے کی خواہش پیدا کرتی ہیں۔ وہاں سے آنے والے اکثر لوگ ایک ایسی جنّت کا نقشہ پیش کرتے ہیں جہاں ہر وہ آسانی اور عیش میسّر ہے جس کی کوئی انسان تمنّا کر سکتا ہے، مگر یہ احوال واقعی نہیں ہے۔ وہ لوگ امریکی طرزِ زندگی کی کٹھنائیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے نہ ان مسائل کا تذکرہ کرتے ہیں جو وہاں جا کر بسنے والوں کے لیے رُوح کا ناسور بن جاتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی جو امریکہ کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ " اجی توبہ کیجیے۔ اُدھر جانے کا نام بھی نہ لینا۔ ارے وہ بھی کوئی زندگی ہے ؟ توبہ توبہ"۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوتے کہیں گے۔

" مگر پرابلم کیا ہے ؟"

"کوئی ایک پرابلم ہے؟ بس یہ سمجھو جہنّم ہے جہنّم۔ وہاں کے مقابلے میں یہاں ہماری زندگی تو جنّت ہے۔ خدا وہاں کسی کو نہ لے جائے۔ مَیں نے تو کانوں کو ہاتھ لگائے اور واپس چلا آیا۔ وہاں انسان بن کر نہیں مشین بن کر رہنا پڑتا ہے۔ یوں سمجھو کہ وہ مُلک ایک بہت بڑی فیکٹری ہے۔ جو بھی وہاں پہنچ جاتا ہے اس مشین کا ایک پُرزہ بن جاتا ہے۔ بس گھستا رہتا ہے اور چلتا رہتا ہے۔ مشین کسی وقت بند نہیں ہوتی اِس لیے آدمی بھی سُکھ کی سانس نہیں لیتا۔ یہ سب کہانیاں ہیں۔ عیش ویش کچھ نہیں ہوتا وہاں۔ نِری کل کل ہے۔"

"مگر سُنا ہے کہ وہاں جا کر یوں لگتا ہے جیسے پریوں کے دیس میں آ گئے ہیں؟"

"یہ کس نے کہا آپ سے؟ بھائی جان۔ دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ خدا بچائے اِن پریوں سے، مجھے تو ڈر لگنے لگا تھا۔ اور یہ بھی یاد رکھیئے کہ وہاں کے رسم و رواج ہمارے آپ کے لیے مناسب نہیں ہیں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز ہی نہیں ہے۔ تہذیب اور اخلاق دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ آوارگی اور بے شرمی؟! توبہ توبہ۔"

اس قسم کے متضاد خیالات سُن کر دل میں یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ ذرا خود ہی چل کر دیکھ آئیں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ یہ ملک واقعی جنّت ہے یا دوزخ؟

۱۹۸۰ء کے اوائل میں ایک فلم کی تیاریوں کے سلسلے میں مجھے انگلستان جانا پڑا۔ بیوی بچے بھی ہمراہ تھے۔ مَیں نے سوچا کہ امریکی ویزا بھی لے لیا جائے۔ ممکن ہے وہاں جانے کا موڈ بن جائے۔ چنانچہ مَیں نے امریکی ویزا آفس کا رُخ کیا۔ چند پاکستانی دوست وہاں کام کرتے تھے۔ ان سے معلومات حاصل کیں تو انھوں نے فارم وغیرہ پُر کرا دیئے اور کہا کہ ویزا دینا یا نہ دینا امریکی صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ ویزا کی درخواستیں اور

پاسپورٹ جمع کرانے کے بعد دوسرے روز مَیں وقتِ مقررہ پر ویزا آفس پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہی ریمنڈ پیپٹر صاحب ویزا ماسٹر ہیں جنھوں نے مجھے امریکہ جانے کا پُرزور مشورہ دیا تھا۔ یہ بھی سُنا تھا کہ جہاں تک مروّت اور لحاظ و ملاحظہ کا تعلق ہے امریکی بھی ہم پاکستانیوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ اس بھروسے پر مَیں بڑے اعتماد سے بیگم کے ہمراہ ایک صوفے پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ سامنے والی کھڑکی میں وہی صاحب نمودار ہوتے اور انھوں نے ایک نام پکارا۔ فوراً ایک نوجوان اُٹھ کر کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اب انھوں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور اتنی جرح کی کہ وہ غریب ہلکان ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ ویزا کی درخواست نامنظور —— اس طرح چند اور لوگ پیش ہوئے جن میں سے ویزا حاصل کرنے والے خوش نصیبوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کے بعد میرا نمبر آ گیا۔ انھوں نے دھیمی آواز میں میرا نام پکارا اور مَیں کھڑکی میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرا پاسپورٹ ان کے سامنے تھا۔ وہ اس کے ورق اُلٹ رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ ان پر کن کن ملکوں کی مہریں ثبت ہیں۔ پھر انھوں نے پاسپورٹ سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

"آپ امریکہ کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

مَیں نے جواب دیا۔

"سیر کے لیے۔"

"مگر پہلے تو آپ کبھی امریکہ نہیں گئے۔ اب اچانک جانے کا خیال کیسے پیدا ہوا؟"

مَیں اس شخص کی بے مروّتی اور طوطا چشمی کا ماتم کرنے لگا۔ پھر کہا۔

"خیال تو کسی وقت بھی پیدا ہو سکتا ہے اس کی کوئی وجہ ضروری تو نہیں ہے۔"

انھوں نے کہا۔

"مگر آپ تو سارے خاندان کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ آخر کیوں؟"

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ مَیں نے کہا۔

"مسٹر پیٹرسن شاید آپ مجھے پہچانتے نہیں؟ مَیں کچھ عرصہ پہلے آپ سے ایک ضیافت میں مِل چکا ہوں اور آپ مجھے یہ پٹّی پڑھاتے رہے ہیں کہ مجھے امریکہ ضرور جانا چاہیئے۔"

انھوں نے چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا اور شناسائی کا تاثر ان کے چہرے پر نمودار ہُوا۔ پھر وہ مُسکرانے لگے اور اس کے بعد قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"اوہ۔ ہائی علی؟!"

انھوں نے خالص امریکی انداز میں دانت نکال کر کہا۔ پھر معذرت کرنے لگے کہ وہ میرا لمبا چوڑا مشکل نام یاد نہیں رکھ سکے تھے۔

مَیں نے کہا۔

"مگر کیا آپ ویزا لینے والوں کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالنا بھی ضروری نہیں سمجھتے؟"

"ایسی بات نہیں ہے" وہ ہنس کر بولے "دیکھنے کی باری تو بعد میں آتی ہے۔ پہلے تو ہم کاغذات کھنگالتے ہیں۔"

"خیر۔ آپ نے کاغذات بھی کھنگال لیے اور اب چہرہ بھی دیکھ لیا۔ اب کیا خیال ہے آپ کا؟"

وہ مُسکرانے لگے۔

"یہ بتایئے۔ آپ جانا کب چاہتے ہیں؟"

مَیں نے کہا۔

"تین چار دن بعد مَیں روانہ ہو جاؤں گا۔"

"اوکے۔"

اُنھوں نے کہا۔

"آپ آج ڈھائی بجے اپنا ویزا لے لیجئے گا۔"

"شکریہ۔"

مَیں نے کہا۔

"کیا میری بیگم کا ساتھ آنا ضروری ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

اِس طرح انٹرویو ختم ہو گیا۔ ڈھائی بجے مَیں کھڑکی پر پہنچا تو ریمنڈ پیٹرسن صاحب موجود نہیں تھے مگر وہ اپنا کام کر گئے تھے۔ پاسپورٹ پر پانچ سال کا ویزا لگا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے یقین آ گیا کہ واقعی پاکستانیوں کی طرح امریکی بھی بامروّت اور دوستی نبھانے والے ہوتے ہیں۔

لندن پہنچ کر پتہ چلا کہ مَیں جس فلم کے سلسلے میں گیا تھا اس کی فلم بندی شروع نہیں کی جا سکتی کیونکہ پاکستان میں ایک نئی فلمی پالیسی مرتّب کی جا رہی تھی اور فلم سازوں کو رجسٹر کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ اس طرح وقتی طور پر فلم کی تیاری کھٹائی میں پڑ گئی۔ مَیں نے سوچا کہ موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر امریکہ کی سیر کرنی چاہیئے۔

واشنگٹن میں اپنے دوست اکمل علیمی صاحب کو فون کیا۔ وہ پاکستان آتے تھے تو مجھے امریکہ آنے کی دعوت دے گئے تھے۔ میرا فون ملا تو فوراً دعوت نامہ جاری کر دیا۔ اس طرح ہم لوگ پین ایم کی فلائیٹ سے نیویارک روانہ ہو گئے۔

نیویارک کے ائرپورٹ پر قدم رکھا تو احساس ہوا کہ واقعی یہ ملک دوسرے ملکوں سے مختلف ہے۔ سب سے پہلی قابلِ ذکر بات تو یہ تھی کہ یہاں مختلف نسلوں کے کالے،

پیلے، لال، سفید چہرے نظر آئے جو سب کے سب امریکن تھے۔ لباسوں میں بھی فرق تھا۔ مگر لہجہ یکساں تھا۔ یہ پہلا تاثر تھا جو امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میں نے قائم کیا۔ پھر امریکی لوگ زیادہ بے تکلف اور ہنس مُکھ نظر آئے۔ یورپ میں مسکراہٹ تو ہوتی ہے مگر رسم و رواج اور اخلاق میں جکڑی ہوتی، انگلستان میں انگریز کا بس چلے تو مسکرانے کو ممنوع قرار دے دے۔ دوکاندار وغیرہ اخلاقاً مسکراتے ضرور ہیں مگر بڑے مکینیکل انداز میں۔ اس کے مقابلے میں امریکی نہ صرف مسکراتے ہیں بلکہ ہنستے بھی ہیں اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ محض اخلاقاً ایسا کر رہے ہیں۔ پھر وہ گرمجوشی پیدا کرنے کے لیے دو چار فقرے اپنی طرف سے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا۔

(BYE TAKE CARE)

چنانچہ ائرپورٹ پر جس سے بات کی وہ مسکراتا ہوا ملا۔ باتیں کرنے کے معاملے میں بھی امریکی کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ لباس اور اطوار کی طرح ان کی باتیں بھی "کھُلی ڈُلی" ہوتی ہیں۔ ہمیں نیویارک سے واشنگٹن جانا تھا اور اس مقصد کے لیے ایک امریکی فضائی کمپنی کے ہوائی جہاز میں سفر کرنا تھا۔ ایک بس میں سوار ہو کر ہم اپنی منزل کی جانب روانہ ہوتے۔ دراصل یہ ائرپورٹ وسعت میں بہت زیادہ ہے اور ہر فضائی کمپنی کا ٹرمنل علیحدہ ہے۔ دُور کے سفر کے لیے بسیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ہم اپنے ٹرمنل پر پہنچ گئے یہاں ایک اور حیرت انگیز تجربہ ہمارا منتظر تھا۔ ائرپورٹ کے جس حصّے میں ہماری فضائی کمپنی کا ٹرمنل تھا وہ مختصر سا تھا اور اس پر ائرپورٹ سے زیادہ کسی ڈرائنگ روم کا گمان گزرتا تھا۔ ہم لوگ صُوفوں اور کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بچّیوں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ بہت جلد ان کی سب سے دوستی ہو گئی۔ مسافر تقریباً سبھی امریکی تھے اور بہت ہنس مُکھ۔ بچّیوں کی شرارتوں پر ہنستے رہے اور ان سے باتیں بھی کرتے رہے۔ مَیں نے ایک دراز قد امریکی سے پوچھا "آپ کے پاس ماچس ہو گی؟"

اس نے خوشی کے مارے پورا مُنہ پھاڑ دیا۔ "شیور!" کہتے ہوئے انھوں نے لائٹر روشن کر کے میری طرف بڑھا دیا۔ کوئی انگریز ہوتا تو ہنسنے ہنسانے کا تکلّف نہ کرتا، اور بڑے رسمی انداز میں کہتا "آف کورس" ابھی ہم دونوں نے باتوں کا آغاز ہی کیا تھا کہ دو ائر ہوسٹس نمودار ہو گئیں۔ وہ کسی یونیفارم میں نہیں تھیں۔ دونوں نے مختلف لباس پہنا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے مُسکراتے ہوئے سب کو متوجّہ کیا اور کہا:

"آپ کی پرواز تیار ہے۔ جہاز پر آ جایئے۔"

گویا ہر چیز ہی غیر رسمی اور یورپ سے یکسر مختلف تھی۔ یہ میرا پہلا تاثر تھا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ امریکی نہ صرف یورپ سے مختلف ہیں بلکہ ساری دُنیا سے نرالے ہیں۔ انھوں نے جب نئی دُنیا بسائی تو طور طریقے بھی نئے ہی اپنائے۔ قانون بھی مختلف بناتے۔ لندن میں ٹریفک بائیں ہاتھ چلتا ہے۔ انھوں نے دائیں جانب شروع کر دیا۔ انگریز بجلی جلانے کے لیے سوئچ نیچے دباتے ہیں جبکہ امریکی سوئچ اُوپر اُٹھاتے ہیں۔ انگریزی کے الفاظ یہ بھی استعمال کرتے ہیں مگر ہجّے مختلف ہیں۔ انھوں نے انگریزی کو زیادہ سہل کر دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ امریکہ والوں نے لوگوں کی زندگیوں کو آسان اور سادہ بنانے پر زیادہ توجّہ دی ہے۔ رسم و رواج اور قاعدے قوانین کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

امریکہ ایک عجیب و غریب اور انوکھا ملک ہے۔ ہر نسل اور قوم کے لوگ یہاں آ گئے ہیں۔ ان کا رشتہ اپنے آبائی وطن سے بھی قائم ہے مگر وہ خالص امریکی ہیں۔ اپنے ملک سے ان کی محبت دیدنی ہے۔ یوں تو پہلے بھی امریکہ میں مختلف ملکوں اور نسلوں کے لوگ آباد تھے مگر اب یوں لگتا ہے کہ کچھ عرصے بعد امریکہ میں کالوں کے علاوہ قدیم باشندے اقلیت میں ہو جائیں گے۔ جس رفتار سے چینی، کوریائی، فلپینی، بھارتی، پاکستانی، عرب، میکسیکن، اطالوی، ایرانی، افغانی اور دوسرے ایشیائی لوگ امریکہ پر چڑھائی کر رہے ہیں اس کے پیشِ نظر چند سال بعد یہی لوگ وہاں دندناتے ہوئے نظر آئیں گے۔ پھر سفید فام لوگوں

کے مقابلے میں ان کی آبادی بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے کیونکہ یہ لوگ بڑے خاندانوں کے قائل ہیں۔ بہت سے امریکی تو ایک بچہ بھی پیدا کرنے کے قائل نہیں ہیں جب کہ ایشیائی خاندان (اور کالوں کے خاندان) عام طور پر پانچ سے دس گیارہ بچوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ تو پھر سوچئے کہ غریب سفید فام لوگوں کا کیا حشر ہوگا؟

امریکہ میں ایک سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ سرمایہ داروں کی جنت ہے۔ سرمایہ پیدا کرنے کے ذرائع بے شمار ہیں اور لوگ ان سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ امریکیوں نے "کریڈٹ" کا جو نظام قائم کیا ہے وہ انسانوں کو بہلانے اور تسخیر کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ ہر چیز قرض ملتی ہے، ہر سہولت، ہر عیش قرض لے کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں نقد قیمت ادا کرنے والوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ہاں، قرض لینے والوں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ ہر ادارہ لوگوں کو قرض دینے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ بلکہ انھیں قرض لینے پر اُکساتا رہتا ہے۔ قرض وصول کرنے کی جلدی بھی نہیں ہے بلکہ وہ کم قرضہ ادا کرنے والوں کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ سود در سود بڑھتا رہتا ہے۔ "کریڈٹ کارڈ" ایک ایسی ایجاد ہے جو دولت مندوں کو قارون اور غریبوں کو بیکس و مجبور بنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ پھر نظام ایسا ہے کہ قرضہ لیے بغیر گزارہ بھی نہیں ہوتا۔ مکان خریدنا ہے تو قرض پر لیجئے۔ کار خریدنی ہے تو قرض پر لیجئے، دوکان خریدنی ہے تو قرضے پر حاضر ہے، ہر قسم کا سامان خریدنا ہے تو شوق سے قرضے پر لیجئے۔ اپنی انشورنس کرانی ہے تو قرضے پر کرائیے، کار کی انشورنس کرانی ہے تو قرضے پر کرا لیجئے۔ غرض دُنیا کی ہر نعمت قرضے پر میسر ہے۔ قرضوں کی وصولی بھی بڑی بے رحمی سے کی جاتی ہے۔ جب تک آپ قرضہ بڑھاتے جا رہے ہیں مگر وقتِ مقررہ پر تھوڑا بہت ادا بھی کرتے جا رہے ہیں تو آپ دی آئی پی ہیں۔ لیکن قرضہ ہضم کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیے گا ورنہ آپ کی خیر نہیں ہے۔ امریکہ میں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آپ کا چیک واپس

ہو جائے۔ ایک دو بار ایسا واقعہ پیش آگیا تو سمجھئے کہ آپ گئے کام سے۔ زندگی وبال ہو کر رہ جائے گی۔

ہمارے ایک دوست نے امریکہ پہنچ کر کار خریدنے کا پروگرام بنایا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اپنی رقم کو محفوظ رکھو۔ کار قرضے پر لے لو۔ وہ کار خریدنے گئے۔ بات چیت ہو گئی۔ چیک دینے لگے تو مشکل پڑ گئی۔ ان کا کسی بنک میں قرضے کا ریکارڈ نہیں تھا۔ قرض کس برتے پر ملتا؟ انھوں نے اپنے بنک کا حوالہ دیا جس میں ان کی بہت بڑی رقم جمع تھی۔ مگر بے سُود۔ آخر انھوں نے دو مختلف بنکوں میں فکس ڈیپازٹ کھولے اور ان کے عوض قرضہ وصول کیا۔ تب کہیں جا کر وہ بھروسے کے قابل سمجھے گئے اور انھیں کار کمپنی نے قرضے پر کار خریدنے کی اجازت دے دی۔ کہیئے۔ ہے نا عجیب بات!

امریکی "عجائبات" کا تذکرہ کرنے بیٹھ جائیں تو طویل دفتر مرتب ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ مجموعۂ اضداد ہے۔ عیش کی بھی انتہا اور دوسری جانب مفلوک الحالی بھی کم نہیں ہے۔ عام آدمی کو زندہ رہنے کے لیے بساط سے بڑھ کر محنت کرنی پڑتی ہے تب کہیں اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتی ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ اس کے پاس ان آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہے اور نہ مُہلت۔ وہ شب و روز شہد کی مکھی کی مانند معاش کے دھندے میں لگا رہتا ہے۔ شہد کی مکھی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ رات کے وقت پوری نیند سو لیتی ہے مگر امریکہ کے انسانوں کو یہ قدرتی آسائش بھی حاصل نہیں ہے۔ اِس غریب کی نیند کبھی پوری نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بسوں، انڈر گراؤنڈ ٹرینوں، ٹیکسیوں میں سوتا جاگتا اور جماتیاں لیتا نظر آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ نیم غنودگی کے عالم میں کار ڈرائیو کرتے ہیں۔ مَیں اپنے ایک دوست کے ہمراہ سڑک پر جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ وہ سو گیا ہے۔ آگے جُھک کر دیکھا تو واقعی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مَیں نے آہستگی سے پکارا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا سو گئے تھے ؟" مَیں نے پوچھا۔

"ہاں۔ نیند آگئی تھی۔"

"مگر یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔"

بولے :

"کچھ بھی خطرناک نہیں ہے۔ مَیں اکثر کار ڈرائیو کرتے ہوتے تھوڑی سی نیند لے لیا کرتا ہوں۔ یار کیا بتاؤں۔ نیند پوری نہیں ہوتی۔ سالہا سال گزر گئے ہیں۔"

"تمھیں یہ ڈر بھی نہیں ہے کہ ایکسیڈنٹ ہو جائے گا ؟"

وہ غنودگی کے عالم میں مُسکرائے اور بولے :

"بس یہی تو اطمینان ہے کہ ایکسیڈنٹ نہیں ہوگا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ یہاں سڑکوں کا اور ٹریفک کا نظام کتنا اچھا ہے ؟ روشن سڑک ہے، سڑک پر نشانات لگے ہوتے ہیں۔ اپنی لین میں، آرام سے چلے جاؤ۔ کوئی سامنے سے آکر ٹکر نہیں مارے گا۔ آپ سڑک پر یہ زرد اور سفید نشانات دیکھ رہے ہیں ؟ بس یہی میرے تحفظ کے ضامن ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد مَیں آنکھیں کھول کر دیکھ لیتا ہوں کہ اپنی لائنوں کے درمیان ہی میں چل رہا ہوں۔ اور پھر بے فکر ہو جاتا ہوں۔ آج تک کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہُوا۔"

دیکھا آپ نے ؟ ایک طرف یہ عالم ہے کہ سونے کی فُرصت نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ اطمینان ہے کہ چاہے بے شک کار چلاتے ہوتے سو جاؤ، کوئی نقصان نہیں پہنچاتے گا۔ اِس کیفیت کا نام امریکہ ہے۔

امریکہ بہت خوبصورت ملک ہے۔ وسائل بھی بے پناہ ہیں۔ صلاحیت مند لوگوں کے لیے ترقی کرنے کے امکانات بھی بہت زیادہ ہیں۔ تعلیم عام ہے۔ ہائی سکول تک تو تعلیم

مفت ہے یا پھر آمدنی کے تناسب سے فیس وصول کی جاتی ہے۔ مگر سکول سب ایک جیسے ہیں۔ نصاب بھی ایک ہے۔ یہاں تک کہ عمارت بھی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ سکولوں میں یونیفارم کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہمارے سکولوں کی طرح بچّوں پر کتابوں کا بوجھ نہیں لادا جاتا نہ ہی ہوم ورک کا انبار دے کر ان کی خوشیاں برباد کی جاتی ہیں۔ پھر بھی تعلیم کا معیار ہم سے کہیں زیادہ اونچا ہے۔ ہائی سکول تک تو تعلیم لازمی ہے۔ امریکی آئین کے مطابق اگر والدین بچّے کو تعلیم نہیں دلاتے تو سزا کے مستحق ہیں۔ البتہ ہائی سکول کے بعد اعلیٰ تعلیم کا حصُول ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بہت مہنگی ہے اور اکثر طلباء اعلیٰ تعلیم کے دوران میں کام کاج کر کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب بہت کم ہوتے ہیں جن کی تعلیم کا سارا بوجھ والدین ہی برداشت کرتے ہیں۔ امریکی نظام اس قسم کا ہے کہ ہر شخص کو بچپن ہی سے کمانے اور اپنے اخراجات برداشت کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ ماں باپ بھی اگر بچّے سے کوئی کام کرانا چاہیں تو معاوضہ اَدا کرتے ہیں اور بچّہ بھی باقاعدہ بھاؤ تاؤ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچّے سمجھ دار ہوتے ہی خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ والدین پر بوجھ بنتے ہیں اور نہ ہی ان کا بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ اولاد اکثر والدین سے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا اختیار طلب کرتی ہے اور مغرب کی مثال پیش کرتی ہے، مگر وہ یہ بھُول جاتی ہے کہ مغرب میں والدین اولاد کے کفیل نہیں ہوتے۔ نہ ہی زندگی بھر ان کے ذمّہ دار ہوتے ہیں۔ اِس لیے اگر مشرقی والدین اولاد کے مستقبل کا فیصلہ خود کرنا چاہتے ہیں تو وہ حق بجانب ہیں کیونکہ اولاد کے غلط فیصلوں کا خمیازہ بھی بالآخر والدین ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

دوسرے مغربی ملکوں کی مانند، بلکہ ان سے بڑھ کر، امریکہ میں خون کے رشتے محض رسمی ہو کر رہ گئے ہیں۔ ماں باپ کو اولاد کی خبر نہیں ہوتی، اولاد ماں باپ سے بے تعلق ہو

جاتی ہے، ہمارے ایک دوست اپنے امریکی دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ تم لوگوں میں اور پرندوں اور جانوروں میں فرق کیا ہے؟ بچّے بڑے ہو جائیں تو وہ بھی ان سے بے تعلق ہو جاتے ہیں اور تم لوگ بھی۔ جذباتیت کا امریکی معاشرے میں بہت کم عمل دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھوں کی زندگی (اگر وہ خوشحال نہ ہوں) تو بے حد تنہا اور کسمپرسی کے عالم میں گزرتی ہے۔ لطف کی بات یہ کہ وہ اپنی اولاد کے اس رویّے کا شکوہ بھی نہیں کرتے۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے بھی اپنے والدین کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا ہوتا ہے۔ یعنی عوض معاوضہ، گِلہ نہ وارد۔

غربت امریکہ میں بھی ہے۔ شب و روز کام کرنے کے باوجود ایسے لوگ بھی ہیں جو ضروریاتِ زندگی حاصل نہیں کر پاتے۔ امریکہ میں کالے تو مفلوک الحال ہوتے ہی ہیں، مَیں نے بدحال گورے خاندان بھی دیکھے ہیں۔ نشے کے عادی اور بھیک مانگنے والے بھی نظر آجاتے ہیں۔ کالے امریکی معاشرے اور معیشت کا ایک لازمی جزو ہیں۔ اب انھیں برابر کے حقوق حاصل ہیں مگر ان کی حالت بہت ابتر ہے۔ اس کی ذمہ داری خود ان لوگوں پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان گھرانوں کے مرد عموماً کام سے بھاگتے ہیں۔ گھریلو ذمہ داریاں قبول نہیں کرتے۔ بچّے بھی آٹھ دس ہوتے ہیں۔ کمانے والی صرف ماں یا بیٹی۔ مرد عیش کرتے اور شرابیں اُڑانے میں لگے رہتے ہیں۔ تعلیم کی سہولت موجود ہے مگر عموماً بچّوں کو تعلیم نہیں دلاتے۔ اس کے باوجود تقدیر کے اور حکومت کے شاکی ہیں۔ سکولوں کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جن علاقوں میں کالوں کی اکثریت ہے وہاں سکولوں میں کالے بچّے بھی زیادہ ہوتے ہیں اور گورے بچّوں کو لامحالہ ان کی بات چیت کا انداز اور لب و لہجہ سیکھنا پڑتا ہے چنانچہ گورے والدین کو شکایت ہے کہ کالوں کی وجہ سے ان کے بچّوں کی زبان اور اطوار خراب ہو رہے ہیں۔ امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں کالے ۷۵ فی صد کے قریب

ہیں چنانچہ دفاتر میں اور سکولوں میں بھی ان کی بہتات ہے۔ اکثر محکموں کے چیف بھی کالے ہیں۔ کیونکہ گوروں کے لیے علیحدہ سکول نہیں ہیں اِس لیے انھیں بھی کالے بچّوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے اور بقول شخصے "ان کی زبان اور عادتیں خراب ہو رہی ہیں" مگر کیا کریں۔ مجبوری ہے۔

مَیں نے امریکہ اور کناڈا کے قیام کے دوران میں جو تاثّرات قائم کیے وہ اِس کتاب میں پیش کر رہا ہوں۔ امریکی شب و روز کا مطالعہ کرنے کے بعد مَیں نے ان کا تجزیہ بھی کیا ہے اور جہاں کہیں ممکن ہوا اپنے ملک اور معاشرے سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ محض سفرنامہ نہیں ہے۔ ایک تجزیاتی مطالعہ بھی ہے!

امریکی غریب

آپ نے شاید وہ لطیفہ سُنا ہو گا کہ ایک امریکی بچّی سے اسکول میں کہا گیا کہ وہ غریبوں کے بارے میں ایک مضمون لکھے۔ بچّی نے مضمون یُوں لکھا :

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شہر میں ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ وہ بے چارہ بہت غریب تھا۔ اس کا شوفر بھی بہت غریب تھا اس کا ٹبلر بھی غریب تھا اس کا بیرا بھی غریب تھا، اس کا خانساماں بھی غریب تھا اس کا مالی بھی غریب تھا غرضیکہ سارا خاندان ۔ بہت غریب تھا۔"

جب ہم نے پہلی بار یہ لطیفہ پڑھا تو اسے محض لطیفہ سمجھ کر بہت ہنسے، مگر جب یورپ اور امریکہ گئے اور اپنی آنکھوں سے یہ دُنیا دیکھی تو پتہ چلا کہ یہ محض لطیفہ نہیں حقیقت بھی ہے۔ امریکی غریب اور پاکستانی غریب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح وہاں کے مصیبت زدوں اور ہمارے مصیبت زدوں میں بہت فرق ہے۔ ہمارے ہاں جب لوگ غریب ہوتے ہیں تو کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ خوش حال خاندان پر بُرے دن آتے ہیں تو وہ سڑک سوار ہو جاتے ہیں۔ مگر مغرب کے بدحالوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ چند سال پہلے انگلستان میں یہ رجحان شروع ہوا کہ امیرزادوں نے اپنے محلّات اور حویلیاں نمائش گاہوں، عجائب گھروں اور تفریح گاہوں میں تبدیل کر دیں اور اس طرح اپنے بُرے

دِنوں کو بھی اچھے دنوں میں بدل دیا۔ خود شہزادی ڈیانا کے والد صاحب جو خاندانی امیرزادے ہیں اپنے محل کو تفریح گاہ میں تبدیل کر چکے ہیں۔ اور لوگ ٹکٹ خرید کر ان کا محل دیکھنے جاتے ہیں۔ یہ اقوام حقیقت پسند ہیں اِسلیئے ان مسائل کو عزتِ نفس یا خاندانی توہین کا مسئلہ نہیں بناتے۔ جب کہ ہمارے معاشرے میں اگر کوئی دولت مند اِس قسم کی حرکت کرے تو اُنگلیاں اُٹھانے والے اِس بے چارے کی زندگی دبال بنادیں۔ پہلے تو یہ دستور محض انگلستان تک محدود تھا مگر جہاں جہاں رئیس بلکہ بگڑے رئیس موجود ہیں وہاں وہاں اب اس طریقے پر عمل کیا جارہا ہے۔ بگڑے رئیسوں کی شمالی امریکہ میں بھی کمی نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد آبادی کے اعتبار سے بہت محدود ہے۔ ان کے بارے میں آئے دن اخبارات میں خبریں شائع ہوتی ہیں۔ پچھلے دنوں وینکوور شہر کی ایک بیوہ کی رقت انگیز کہانی اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ بے چاری بہت بُرے دنوں کا سامنا کر رہی ہے۔ اور اس کا احوال بھی اس غریب آدمی سے مختلف نہیں ہے جس کے بارے میں امریکی بچی نے جواب مضمون لکھا تھا۔ مغربی وینکوور کا علاقہ کسی زمانہ میں خاندانی رئیسوں اور دولت مندوں کی رہائش گاہ تھا۔ اِس علاقے میں زیادہ تر برطانوی نژاد لوگ رہا کرتے تھے۔ اب معاشی بدحالی نے ان کا بھی حال پتلا کر دیا ہے۔ اِسی قسم کی ایک بدحال بیوہ بابی بف بھی ہیں۔ وہ کہتی ہیں :۔

"جناب۔ بُرا وقت ہمارے دروازے پر دستک نہیں دے رہا وہ تو ہمارے گھر کے اندر آچکا ہے"۔

ثبوت اس کا یہ ہے کہ فی الحال اس عفیفہ نے اپنی متعدد رولز رائس کاروں میں سے ایک قیمتی کار کو پرائیویٹ ٹیکسی کے طور پر چلانا شروع کر دیا ہے۔ شوفر کے فرائض وہ خود سرانجام دیتی ہیں۔ ان کی اس کار کی قیمت صرف ایک لاکھ تیس ہزار ڈالر ہے۔ وہ اِس قیمتی کار کا کرایہ سو ڈالر فی گھنٹہ وصول کرتی ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی قیمتی کاروں کو بیچ کیوں نہیں دیتیں۔ تو انھوں نے جواب دیا :۔ اتنی مہنگی کار اس زمانے میں کون خریدے گا؟

اب اس غریب بیوہ کی غربت کا احوال بھی سُن لیجئے۔ ان کا ایک شاندار محل ہے۔ ان کے پاس بے شمار نادر مصوری کے شاہکار ہیں۔ سترہویں صدی کے بہت سے نوادرات ہیں اور زیورات بھی ہیں۔ مگر وہ ان چیزوں کو فروخت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔ کار کو پرائیویٹ ٹیکسی کے طور پر چلانے کا مقصد یہ ہے کہ قرضوں کی ادائیگی میں سہولت ہو جاتے۔ مسز ہف کا بیان ہے کہ جب سے وہ معاشی بدحالی کا شکار ہوئی ہیں وہ بہت سے زیورات، قیمتی نوادر، پُرانا قیمتی فرنیچر فروخت کر چکی ہیں۔ مگر وہ گھر کو فروخت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔ انھوں نے یہ محل نما گھر چھ سال پہلے خریدا تھا۔ یہ گھر ۸ ہزار مربع فٹ کے رقبہ پر بنا ہُوا ہے۔ اردگرد سوا ایکڑ کا باغ ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مَیں اِس گھر کو ہر قیمت پر اپنے پاس رکھوں گی۔ ظاہر ہے کہ سب کی دُعائیں اور ہمدردیاں اِس "غریب بیوہ" کے ساتھ ہیں۔

کچھ عرصہ قبل پاکستان میں ایک فلم ساز اور تقسیم کار نے ایک بہت پُرانی فلم "چھوٹی بیگم" نمائش کے لیے کراچی میں پیش کی۔ یہ فلم بلیک اینڈ وہائٹ ہے اور کافی پُرانی ہے مگر باکس آفس پر اسے ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ اس تجربے کی روشنی میں دوسری پُرانی فلمیں بھی نمائش کے لیے پیش کی گئیں اور اکثر کامیاب ہوئیں۔ یہ تو تھا پاکستان کا معاملہ۔ اب سُنیئے کہ امریکہ میں بھی اب "نیا نو دن۔ پُرانا سو دن" کے مصداق پُرانی فلموں کی نمائش کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور کامیاب ہے۔

سب سے پہلے یہاں ایک فلم "اے اسٹار از بورن" کی نمائش ہوئی اور وہ بے حد مقبول ہوئی۔ امریکہ والوں کے بارے میں یہ بات تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ دولت کمانے کے طریقے جو اُنھیں آتے ہیں وہ دوسروں کو نہیں آتے۔

اب امریکی فلم سازوں نے اپنے پُرانے ذخیرے کھنگالنے شروع کر دیئے ہیں اور بہت سی پُرانی فلموں کو نئے انداز اور نئی پبلسٹی کے ساتھ نمائش کے لیے پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے بلکہ اب تو یہ بھی ہونے لگا ہے کہ انتہائی ابتدائی زمانے کی فلموں کو بھی فلمی عجائب گھروں

سے حاصل کرکے ان کے نئے پرنٹ نکال کر نمائش کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ ان پرانی فلموں کے وڈیو کیسٹ بنانے کا پروگرام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

پرانی فلم ساز کمپنیوں نے اپنے "خزانوں" کا جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ایم۔ جی۔ ایم ایسی کمپنی ہے جس کے پاس قدیم کامیاب فلموں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ فاکس کے پاس بھی کامیاب اور ناکام پرانی فلموں کا ڈھیر موجود ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جو گرانقدر فلمیں بڑی لاگت کے باوجود ابتدائی نمائش کے دوران فیل ہو گئی تھیں اب کافی عرصہ بعد ان کی نمائش منفعت بخش ہے۔ مثلاً فاکس کی مشہور زمانہ فلم "کلوپیٹرا" بڑی لاگت کی فلم تھی، اس کی تشہیر بھی زور و شور سے کی گئی تھی۔ غالباً ہماری فلمی صنعت میں کل جتنا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ تو کلوپیٹرا کی عالمگیر پبلسٹی پر صرف کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ فلم اس پبلسٹی، بڑی لاگت اور الزبتھ ٹیلر اور رچرڈ برٹن کے مشہور زمانہ بلکہ رسوائے زمانہ اسکینڈل کے باوجود کامیاب نہ ہو سکی اور اس کی ناکامی کے ساتھ ہی کئی بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کا بھی دیوالیہ نکل گیا۔ یہ فلم ۱۹۶۳ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ خیال ہے کہ اب یہ فلم بہت دولت کمائے گی۔ اس فلم کی طوالت بہت تھی۔ اصل لمبائی تو اتنی تھی کہ چھ گھنٹے کی فلم بنائی گئی تھی مگر پھر کاٹ چھانٹ کر اسے چار گھنٹے کی طوالت دے دی گئی تھی۔ مگر اب خیال ہے کہ اسے پھر چھ گھنٹے کی سکریننگ پر پھیلا دیا جائے گا۔ جو بے شمار فلمیں دوبارہ نمائش کے لیے پیش کی جائیں گی ان میں سینکڑوں بلیک اینڈ وہائٹ فلمیں بھی شامل ہیں۔ ان فلموں کی نمائش سے اور ان کے وڈیو کے حقوق فروخت کر کے فلم کمپنیاں کروڑوں بلکہ اربوں ڈالر کمانے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔

- فلموں اور خصوصاً پنجابی فلموں کو ہمارے ملک میں سماجی برائیوں اور جرائم کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ ایک بحث طلب موضوع ہے۔ فلمیں معاشرے پر کس طرح اور کتنی اثر انداز ہوتی ہیں اور معاشرہ فلموں کو کس حد تک متاثر کرتا ہے یہ ایک قابلِ غور سوال ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلموں میں جرائم اور تشدد دنیا بھر میں عام ہو چکا ہے۔ خود ہمارے ملک میں جو سنسر بورڈ،

اردو اور پنجابی فلموں کو پُرتشدد قرار دیتا ہے وہی درآمدی فلموں کے حد سے زیادہ تشدد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ہر دس لی کی فلموں میں سوائے مار دھاڑ قتل و غارت اور خون خرابے کے اور کیا ہوتا ہے؟ مگر یہ پاکستان میں خوب چلتی ہیں۔ اسی طرح مغربی ممالک جاپان اور ہانگ کانگ وغیرہ کی مار دھاڑ سے بھرپور فلموں کو بھی نمائش کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ فلموں پر ہی منحصر نہیں ہے، ٹیلی ویژن بھی تشدد اور جرائم کو پھیلانے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ خود پاکستان میں ٹیلی ویژن پر بیرونی ملکوں کے جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے بیشتر تشدد اور خون ریزی سے بھرپور ہوتے ہیں اور ان میں جرائم کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ امریکہ اور یورپ میں ٹیلی ویژن عام لوگوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ چوبیس گھنٹے ٹی وی کے بعض چینل پر پروگرام پیش کرتے رہتے ہیں اور ان میں بیشتر پروگرام جرائم کی تصویر کشی کرتے ہیں اور مار کٹائی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ٹی وی ایک ایسا دیو ہے جس کے اثر سے کوئی امریکی اور یورپی گھرانہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔

ٹی وی اور معاشرہ

لندن میں بی بی سی ٹیلی ویژن کسی زمانہ میں سنجیدہ پروگرام بھی پیش کر دیا کرتا تھا مگر جب سے یہاں کمرشل ٹی وی آیا ہے یہاں بھی وہی مار دھاڑ اور جرائم کی بھرمار نظر آتی ہے لطف کی بات یہ ہے کہ چند پروگراموں کو چھوڑ کر لندن میں کمرشل ٹی وی اور انڈی پنڈنٹ ٹی وی کے زیادہ تر پروگرام امریکہ سے درآمد کیے جاتے ہیں اور یہی پروگرام زیادہ مقبول اور دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ یہاں امریکی ٹی وی فلمیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اور یہ تشدد سے لبریز ہوتی ہیں مگر اب امریکہ اور یورپ میں نہایت سنجیدگی سے اِس مسئلے پر غور کیا جا رہا ہے کہ کیا واقعی ٹی وی جرائم اور خرابیاں پھیلانے کا ذمہ دار ہے خصوصاً نوجوانوں کو خراب کرنے میں کیا ٹی وی کا سب سے نمایاں حصّہ ہے؟

ٹی وی والے کہتے ہیں کہ ہمیں الزام نہ دیجئے۔ ہمارے پروگرام تو معاشرہ کا عکس ہوتے ہیں اور یہ ہمارا فرض ہے۔ لیکن نقادوں کا کہنا ہے کہ ٹی وی کے زیادہ تر پروگراموں کا مقصد تشدد کا پرچار ہے اور ٹی وی پروگرام نوجوانوں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ نہ تو تشدد بُری چیز ہے اور نہ ہی ظلم اور ناانصافی کا بدلہ لینے کے لیے قانون کو اپنے ہاتھ لینا قابلِ اعتراض عمل ہے۔ اِن پروگراموں میں ہیرو وہی لوگ ہوتے ہیں جو قتل و غارت گری میں کسی طرح بھی ویلن سے کم نہیں ہوتے اور انسانوں کی جان لینا تو ان کے لیے کسی طرح بھی ہچکچاہٹ کی بات نہیں

ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ایک جائزے کے مطابق بی بی سی لندن کے ۶۲ فیصد پروگرام تشدد سے بھرپور ہوا کرتے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ قتل و غارت گری کی فلمیں زیادہ تر شام کو نو بجے سے پہلے پیش کی جاتی تھیں جبکہ بچّے اور کم عمر لوگ سب سے زیادہ ٹی وی دیکھتے ہیں۔ جن بچّوں کو گھنٹوں تشدد اور جرائم کے پروگرام دیکھنے کو ملیں گے وہ بھلا قانون اور معاشرے کی کیا پروا کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ مغرب کی سوسائٹی میں بھی تشدد اور جرائم اب ایک معمول کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ امریکہ میں ۱۹۵۵ء میں ٹی وی میں پہلی بار کمرشل پروگرام پیش کیے گئے اور اسی وقت سے جرائم اور مار دھاڑ کی رسائی ٹی وی اسکرین کے ذریعہ گھروں تک ہو گئی۔ اس وقت قانون شکنی کے جرائم صرف ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ تھے جب کہ ۱۹۷۰ء میں جرائم کی تعداد اٹھ ہزار کے قریب ہو گئی اور ۱۹۸۲ء میں اس قسم کے ایک لاکھ پانچ ہزار جرائم ہوئے ہر سال جرائم کی رفتار میں سات سے دس فیصد تک اضافہ ہوتا رہا اور اس پر بے روزگاری یا اقتصادی بدحالی کا مطلق کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آیا۔ انگلینڈ کے علاوہ امریکہ کینیڈا، آسٹریلیا اور دوسرے یورپی ممالک میں بھی جرائم کی رفتار میں تیزی سے اضافہ ہوا جس کا سبب ٹی وی کو قرار دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ دس سال سے کم عمر کے بچّوں میں بھی جرائم کا رجحان اب تیزی سے بڑھ رہا ہے جسے محض ٹی وی کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے کیا اس کو آپ غُربت، بے روزگاری یا سماجی ناانصافیوں کا نتیجہ قرار دیں گے؟ اِس لیے کہ دس سال سے کم عمر کے بچّے ان عوامل کے نتائج و عواقب سے قطعاً بے نیاز اور بے خبر ہوتے ہیں۔ پھر بوڑھی عورتوں کو لوٹنے مارنے، قتل کرنے اور ان کی آبروریزی کرنے کے واقعات میں نہایت تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اِس قسم کے مجرموں کی بڑی تعداد نوعمر لڑکوں (اور کسی حد تک لڑکیوں پر) مشتمل ہوتی ہے۔ امریکہ کے دو صدر اس مقصد کے لیے خصوصی کمیشن قائم کر چکے ہیں۔ اور ان دونوں نے ٹی وی کو سماجی بُرائیوں اور جرائم کا ذمہ دار قرار دیا ہے مگر ٹی وی بہت بڑی مالیاتی قوّت ہے جس کے خلاف نبرد آزما ہونا کسی بھی امریکی صدر کے لیے ممکن نہیں

ہے۔ سائنس دانوں اور ماہرین عمرانیات نے بھی جرائم، منشیات اور کینسر کا زیادہ ذمہ دار ٹی وی کو ہی قرار دیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ٹی وی کے "جن" پر قابو پانا بھی حکومتوں کے لیے ناممکن ہے۔ ٹی وی اب مغربی ممالک کی ایک ناگزیر ضرورت بن چکا ہے لوگ (اور بچے بھی) اپنا ۹۵ فی صد وقت بزرگوں، والدین اور دوستوں کی بجائے ٹی وی کے ساتھ گزارتے ہیں اور وہ ان کا بہترین رفیق ہونے کے ساتھ ساتھ وقت گزاری اور تفریح کا سب سے موثر ذریعہ بھی ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں بعض ٹی وی چینل ۲۴ گھنٹے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ دن اور رات کے ہر حصے میں کمرشل اور تفریحی پروگرام اور فلمیں تسلسل کے ساتھ دکھائی جاتی ہیں۔ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خبروں کو امریکی ٹی وی نے ایک دلچسپ اور دلکش پروگرام کی شکل دے دی ہے اور نیوز بلیٹن تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ پیش کش کا انداز نہایت دلچسپ اور دلنشیں ہوتا ہے۔ مجھے انتہائی حیرت ہوتی جب ایک رات چار بجے میں نے ٹی وی کھولا اور دیکھا کہ نہایت زور شور کے ساتھ خبریں پیش کی جا رہی تھیں اور ساتھ ہی اشتہاروں کی ویسی ہی بھرمار تھی جیسی دن کے وقت ہوتی ہے۔ بچوں کے لیے کارٹون صبح پانچ بجے شروع ہو جاتے ہیں۔ کارٹونوں میں بھی اب جرائم اور تشدد کا عنصر زیادہ ہو گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ٹی وی ان لوگوں کے لیے ایک لازمی چیز بن چکا ہے۔ اسی لیے اس کے اثرات بھی ہمہ گیر ہیں۔

خبروں — تشدد اور جرائم کے پروگراموں کے علاوہ کمرشل انعامی پروگرام (نیلام گھر ٹائپ کے) بکثرت پیش کیے جاتے ہیں۔ اور بے حد مقبول ہیں۔ ان پروگراموں میں نہایت معمولی اور سہل سوالات کے بدلے تفریحی بیرونی دورے، فرنیچر۔ اور کاریں فراخ دلی کے ساتھ انعام میں بخش دی جاتی ہیں۔ باقی ماندہ پروگرام مزاحیہ خاکے اور ڈرامے ہوتے ہیں اور پھبتی، فقرہ بازی اور جگت بازی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ ابتذال اور بذذوقی کی حد کو چھو لیتے ہیں مگر بہت زیادہ مقبول ہیں۔ انگلستان کا ٹی وی کسی حد تک ان چیزوں سے محروم تھا، وجہ یہ کہ اوّل تو ٹی وی کے پروگرام چوبیس گھنٹے نہیں پیش کیے جاتے

دوسرے معلوماتی اور تعلیمی پروگراموں پر بھی زور دیا جاتا ہے تیسری اور بڑی وجہ اب تک تو یہ تھی کہ انگلستان میں ٹی وی سے کمرشل پروگرام پیش نہیں کیے جاتے تھے۔ مگر اب یہاں بھی تجارتی پروگرام پیش ہونے لگے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کاروباری مصلحتوں اور مالی مقاصد کو مدنظر رکھ کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انگلستان میں بھی تفریح پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے اور آپ جانتے کہ آج کے دور میں ٹی وی پر تفریح کا مطلب ہے مار دھاڑ اور جرائم — ان حالات میں ٹی وی جرائم اور تشدد سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے اور معاشرہ اگر جرائم اور تشدد کا شکار نہ ہو تو کیونکر نہ ہو!

بن باسی !

ایک زمانہ تھا جب دُنیا میں ہر جگہ خوشحالی اور امن و امان کا دَور دورہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ترقّی پذیر ملکوں کے مقابلے میں یورپ اور امریکہ جنّت کا ٹکڑا ہی لگتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ وہاں گئے اور آباد ہو گئے وقتی طور پر انھیں خوشحالی بھی نصیب ہو گئی اور عیش و آرام کی راحتیں بھی مل گئیں مگر جب ساری دُنیا میں حالات بدلنے لگے تو یورپ اور امریکہ کی "جنّت" بھی گردشِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اب ان ملکوں کے اپنے مسائل ہیں جنھیں حل کرنے کے لیے انھیں وسائل کی ضرورت ہے۔ جب زندگی خود وہاں کے لوگوں پر مہربان نہیں رہی تو پھر باہر سے آکر آباد ہونے والوں کی مشکلات کا خود ہی اندازہ لگا لیجیے۔

اقتصادی اور معاشی شکنجے نے انھیں بھی کَس کر رکھ دیا ہے۔ اوپر سے ستم یہ کہ مقامی آبادی کی معاشی بدحالی نے اسے زیادہ حسّاس اور بے صبرا بنا دیا ہے۔ اب ان لوگوں میں بھی برداشت کی قوّت نہیں رہی۔ جب خود ہی پیٹ بھرنے کی آسائش حاصل نہ ہو، تو دوسروں کو حصّہ دینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اقتصادی بدحالی نے یورپ اور امریکہ کو بھی بے حال کر کے رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر وہاں جا کر آباد ہونے والے مشرقی لوگوں پر بھی پڑا ہے۔ مقامی آبادی کا روّیہ اب سخت اور ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے اس پر سے معاشرتی مسائل اتنے زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ خصوصاً پاکستانیوں کے لیے

زندگی بہت کٹھن اور دشوار ہو گئی ہے۔ اِس کے باوجود روزگار اور بہتر زندگی کے لالچ میں یہ لوگ سمجھوتہ کرتے رہے ہیں لیکن اب مقامی حکومتوں کا روّیہ بھی بدلنے لگا ہے۔ ہر جگہ امیگریشن کے قوانین سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ غیر ملکیوں کے خلاف جذبات بھڑکنے لگے ہیں اور وہ دن دُور نہیں جب اِن ممالک میں ہمارے ہم وطنوں کا رہنا تقریباً دوبھر ہو جائے گا اور اس وقت انھیں اپنے وطن کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ ہو گا۔ یہ تسلیم کہ مغربی ممالک میں جا کر رہنے والوں کو کچھ سہولتیں اور آسائشیں حاصل ہیں لیکن اس کے مقابلے میں انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا بھی ہے جن سے وہ اپنے ملک میں دوچار نہیں ہوتے۔ مہنگائی کا عفریت وہاں بھی پھنکاریں مار رہا ہے۔ اقتصادی مسائل وہاں بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ بے روزگاری روز افزوں ہے۔ عام آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ محض ایک کام کر کے اپنی ضرورتیں پوری کر سکے۔ نتیجہ یہ کہ اسے لازمی کم از کم دو ملازمتیں کرنی پڑتی ہیں اور وہ کولھو کا بیل بن کر رہ گیا ہے۔ معاشرے سے رواداری اور برداشت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مقامی آبادی کی طرف سے تشدّد، نفرت اور حقارت کے جذبات میں اضافہ ہو رہا ہے اور اب تو کُھلم کُھلا اِن جذبات کا اظہار بھی کیا جانے لگا ہے۔ ان حالات میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ملک سے باہر چلا جانا ان کے تمام مسائل کا حل اور سارے دکھوں کا علاج ہے وہ احمقوں کی جنّت میں رہتے ہیں۔

جو لوگ روزگار اور بہتر زندگی کی تلاش میں یورپ اور امریکہ جاتے ہیں ان کی مجبوری کا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن ایسے لوگ بھی اس سرزمین پر موجود ہیں جو پاکستان سے دولت کما کر اسے باہر روانہ کر رہے ہیں لیکن وہ یہ بھول رہے ہیں کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ان کی دولت کے ڈھیر بھی ان کی مدد نہ کر سکیں گے اور انھیں ایک دن بحسرت و یاس واپس اپنے ملک میں آنا پڑے گا۔ یاد رکھیے دُنیا میں اپنے ملک اور اپنے وطن سے بڑھ کر کوئی جگہ نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی اور ملک آغوش کی وہ گرمی فراہم

کر سکتا ہے جو دھرتی ماتا سے ملتی ہے۔

پاکستانیوں کے لیے مغرب جانے کی تمنا کوئی نئی نہیں ہے لیکن گزشتہ چند سالوں میں جتنی بڑی تعداد میں لوگ جائز یا ناجائز ذرائع سے باہر گئے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ بھٹو صاحب کی حکومت کے خاتمے کے بعد پاکستانیوں نے مغربی ممالک میں قدم ٹکانے کے لیے یہ عذر تلاش کیا کہ اپنے ملک میں انکی زندگی خطرے میں ہے۔ اِس لیے انھیں سیاسی پناہ دی جاتے۔ مغربی ممالک کی جمہوریت پسندی نے بے شمار لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ چند سال ہوئے مَیں امریکہ گیا تو بہت بڑی تعداد میں پاکستانی سیاسی پناہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ورجینیا میں ایک وکیل نے مجھ سے پوچھا:

"آپ کے ملک میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ سیاست میں ملوّث ہوتے ہیں؟ آپ لوگ سیاسی مخالفین کا وجود برداشت کیوں نہیں کرتے؟"

اب مَیں انھیں کیا بتاتا کہ ع

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی

ہر شخص ٹھکانہ حاصل کرنے کے لیے اپنے ملک کو بدنام کر رہا ہے۔ ورنہ وطن کے دروازے ان لوگوں پر کبھی بھی بند نہیں ہوتے۔ ذرا اُن لیڈرانِ کرام کی فہرست پر نظر ڈالیں جو خودساختہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لیے بیرونِ ملک مقیم ہیں اور اُن حکومتوں کو یہ باور کرا چکے ہیں کہ انھوں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ دن ان کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ جب حالات بے حد سازگار ہو جاتے ہیں تو یہی لوگ واپس پاکستان آجاتے ہیں اور اپنے گزشتہ طرزِ عمل پر نادم بھی نہیں ہوتے۔

مَیں نے بیرونی ممالک میں پاکستانیوں کو دیکھا ہے۔ ان کی باتیں سُنی ہیں، ان کے جذبات سے آگاہی حاصل کی ہے۔ ان کے مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ یقین کیجیے ہزار میں سے پانچ

پاکستانی بھی ایسے نہیں جو دل سے چاہتے ہوں کہ باہر رہیں۔ اگر ان کی مجبوریاں اور ضرورتیں سدِراہ نہ ہوں تو وہ ایک لمحہ بھی وطن سے باہر گزارنا پسند نہیں کرتے۔

ان میں محنت مزدوری کے ذریعے روزی کمانے والے بھی شامل ہیں اور دولت مند کاروباری بھی۔ مَیں نے کسی کو بھی خوش، پُرسکون اور مطمئن نہیں پایا۔ وہ اِسی فکر میں رہتے ہیں کہ کون سی ترکیب ہو جس کی مدد سے وہ اپنے ملک واپس چلے جائیں۔ بیشتر لوگوں کا مسئلہ اقتصادی ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں زندگی کتنی ہی مشکل سہی اس میں کوئی شک نہیں گر پڑ کر بھی وہاں انھیں ایسی سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں جن کا حصول خود اپنے ملک میں ان کے لیے ناممکنات میں سے ہے۔ ایئرکنڈیشنڈ گھر، کار، شہری سہولتیں اور زندگی کی وہ آسائشیں جو وہاں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں انھیں بوجوہ اپنے ملک میں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ مگر اس کے مقابلے میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جو انھیں صرف اور صرف اپنے ملک میں ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ پھر بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اب مقامی آبادی اور حکومت بھی ان کا وجود برداشت نہیں کرتی۔ اب نہیں تو دس پندرہ سال کے بعد ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب ان لوگوں کے لیے اپنے وطن واپسی کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہے گا۔ ان کو وطن واپس آکر از سرِ نو زندگی کا آغاز کرنا ہوگا جو اُن کے لیے عملی طور پر بہت دشوار ہوگا۔ خیر جو لوگ وہاں جاکر آباد ہو چکے ہیں اُن کو تو چھوڑیئے مگر اُن لوگوں کو ضرور حالات کا جائزہ لینا چاہیئے جو آج بھی باہر جانے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ اب دُنیا کے ہر ملک میں حالات بدل چکے ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر یورپ تباہی کا شکار تھا۔ اسے تعمیرِ نو کے لیے اور اپنی صنعتوں کو از سرِ نو قائم کرنے اور ترقی دینے کے لیے محنت کاروں کی ضرورت تھی۔ جنگ کا ایندھن بننے کی وجہ سے مردوں کی آبادی کم ہو گئی تھی۔ اِس لیے یورپ نے مشرقی اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کے لوگوں کا خیر مقدم کیا اور انھیں اپنی صنعتوں اور دوسری ترقیاتی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے استعمال کیا۔ یہی حال کناڈا اور آسٹریلیا میں تھا۔

کناڈا کو اپنے وسیع و عریض بنجر علاقوں کو سرسبز بنانے کے لیے مین پاور کی ضرورت تھی چنانچہ ایک وہ زمانہ بھی تھا جب پاکستان یا ہندوستان سے کوئی خاندان کناڈا کے کسی ایئرپورٹ پر پہنچتا تھا تو اسے ایئرپورٹ ہی پر کناڈا کی شہریت دے دی جاتی تھی۔ اَب حالات اس کے برعکس ہیں۔ امریکہ دنیا بھر کے پناہ گزینوں کی یلغار کی زد میں ہے۔ تمام دُنیا سے لوگ امریکہ جاکر آباد ہونے کے خواہشمند ہیں۔ لیکن اب امریکہ کے وسائل کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا ہے اور وہاں کی معیشت مزید غیر ملکیوں کو قبول کرنے کے حق میں نہیں آبادی بڑھ چکی ہے۔ وسائل سمٹ رہے ہیں۔ اقتصادی حالات ابتر ہو رہے ہیں، بے روزگاری کا عفریت سر اٹھا رہا ہے، اب یورپ والوں کو سستے مزدوروں کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ تو خود اپنے مقامی باشندوں کو روزگار اور آسائش زندگی فراہم کرنے سے قاصر ہیں پھر ان ملکوں میں نئی نسلیں جوان ہو چکی ہیں جن کا تاثر یہ ہے کہ غیر ملکی نہیں ہے۔ یورپ کی حالت اور زیادہ خراب ہے۔ ان کے ملکوں میں آباد ہو کر ان کی حق تلفی کر رہے ہیں ایشیائی لوگ کفایت پسند ہیں۔ اِس لیے بظاہر زیادہ خوش حال نظر آتے ہیں اور ان کی یہ خوشحالی بھی یورپ کے نوجوانوں کے لیے قابلِ برداشت نہیں ہے۔ اِس لیے ان کا رویہ اب زیادہ جارحانہ ہو گیا ہے۔

جو لوگ آج بھی ملک سے باہر جانے کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ یہ بھول گئے ہیں کہ اب وہ زمانہ آچکا ہے جب انسانوں کو ان کے اپنے ملکوں کے سوا کہیں اور ٹھکانہ نہیں مل سکے گا۔ یوں بھی قدرت نے انسانوں کے لیے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان میں سرفہرست "وطن" بھی ہے۔ بے وطن لوگوں کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو بحالت مجبوری "وطن" کی سرزمین سے دُور زندگی گزارنے کے لیے مجبور رہیں۔ اپنے وطن سے بڑھ کر کوئی سرزمین نہیں ہوتی۔ اگر لوگ دوسری جنتوں کی تلاش میں جانے کی بجائے خود اپنے ملکوں ہی کو جنت بنانے کی کوشش کریں اور اس کے لیے جدوجہد

کریں تو کیا یہ زیادہ مناسب اور بہتر نہ ہوگا۔

دراصل ہمارے ہم وطن یہ سمجھتے ہیں کہ ساری پریشانی اور مصیبت بس اسی ملک میں ہے۔ باقی دوسرے ملکوں میں تو دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ عیش و طرب کی زندگی ہے۔ بے فکری اور خوشحالی کا دَور دورہ ہے۔ غرضیکہ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ بس ان کے اس ملک سے باہر جانے کی دیر ہے کہ ان کی ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ سارے مصائب ختم ہو جائیں گے سارے دلدّر دُور ہو جائیں گے۔

حالانکہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ پاکستانی اور غیر ملکی نکالے جا رہے ہیں۔ مغربی جرمنی سے وہ پاکستانی اب اپنا بستر بوریا سمیٹ کر امریکہ اور کناڈا کا رُخ کر رہے ہیں جنھوں نے وہاں سیاسی پناہ حاصل کر رکھی تھی۔ اب وہ ساتبان ان کے سروں سے کھینچ لیا گیا ہے۔ مغربی جرمنی کی حکومت اب غیر ملکیوں سے بیزار ہو چکی ہے اور انھیں واپس بھیج رہی ہے۔ مغربی جرمنی کی ٹریول ایجنسیاں ان سے خوب ہاتھ رنگ رہی ہیں۔ یہ لوگ اب سیاسی پناہ کی تلاش میں دوسرے مغربی ملکوں کا رُخ کر رہے ہیں مگر یہ بھول گئے ہیں کہ وہاں بھی ان کے لیے سوائے پریشانیوں اور دکھوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہ تو بیچارے عام لوگ ہیں۔ شہنشاہِ ایران نے جب "مجبور" ہو کر اپنے ملک کی سرزمین کو چھوڑا تو دُنیا ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ جہاں گئے وہاں انھیں نہ ٹھکانہ ملا نہ سکون اور آرام۔ تازہ ترین مثال فلپائن کے سابق صدر مارکوس صاحب کی ہے، جنھیں ؏

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی

امریکہ میں مذہب

آزادیٔ نسواں کی تحریک پاکستان میں بھی چل رہی ہے اور خوب زور شور سے چل رہی ہے۔ خواتین کی آزادی اور مساوات کا مسئلہ یوں تو پہلے بھی ہر معاشرے میں موجود رہا ہے اور ہر قوم ملک اور معاشرے نے اس کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کی ہے مگر "آزادیٔ نسواں" کی جنگ میں زیادہ جوش و خروش پہلے مغرب میں پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغرب کی دوسری "برکات" کی طرح آزادیٔ نسواں اور "ویمن لب" کی تحریک نے بھی ترقی پذیر ملکوں کو اپنی زد میں لے لیا جب ہم غلام تھے تو یوں بھی انگریزوں کی ہر بات اور ہر ادا ہمیں بہت اچھی لگتی تھی کچھ مغرب کی صنعتی ترقیوں اور تکنیکی اور سائنسی ایجادات کا رعب تھا اور کچھ اپنی غلامی کی وجہ سے کمتری کا احساس۔ اس لیے یہ لازمی تھا کہ ہر عورت یا مرد مغربی علوم اور خصوصاً انگریزی زبان پڑھے۔ اور مغربی طور طریقوں پر بھی ایمان لائے چنانچہ عورتوں کی آزادی اور مساوات کا غلغلہ بھی ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں میں بلند ہوا۔ وہ دن اور آج کا دن "آزادیٔ نسواں" کا مطالبہ برابر زور ہی پکڑتا جا رہا ہے جو لوگ اور خواتین آنکھیں بند کر کے یورپ اور امریکہ کی تقلید کرتے ہیں وہ اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے یہ غور کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے کہ دراصل عورتوں کے حقوق کی جو ضمانت اسلام نے پیش کی وہ مغرب کو بہت دیر سے نصیب ہوئی۔ یورپ کے بہت سے ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی یافتہ خواتین

کو ووٹ تک کا حق حاصل نہیں تھا، بہت سے ایسے حقوق جو اسلام نے عورت کو پہلے ہی عطا کر دیئے تھے ابھی تک بعض یورپی ملکوں کی عورتیں ان سے محروم ہیں۔

بہرحال یہ تو بطور تذکرہ تھا دراصل موضوع یہ ہے کہ مغرب والے اب خواتین کی آزادی اور برابری کے مسئلے کو کس انتہا تک لے جا چکے ہیں؟ مغرب کی عورتوں اور عورتوں کے حامیوں نے عرصہ دراز سے یہ مہم شروع کر رکھی ہے کہ صاحب۔ یہ کیا بات ہے کہ "خدا" کو مذکر کہا جاتا ہے۔ یہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی ہے اور اس طرح عورتوں پر مردوں کی برتری خواہ مخواہ بلکہ زبردستی تھوپ دی گئی ہے۔ مثلاً بائبل میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "لارڈ (خدا) میرا گڈریا ہے"۔ نقادوں اور معترضین کا کہنا ہے کہ اس کی بجائے یہ بھی کہا جا سکتا ہے "لیڈی میری گڈریا ہے" اس طرح مرد ذات کی برتری ثابت نہیں ہوگی۔ اسی طرح ایک جگہ بائبل کہتی ہے "اپنی پڑوسی کی بیوی کو لالچ سے نہ دیکھو" مگر یہ تو "ویمن لب" کے اصول کے خلاف ہے چنانچہ اس میں یہ اضافہ کر دیا گیا ہے "اپنے پڑوسی کی بیوی یا (شوہر) کو للچائی ہوئی نظر سے مت دیکھو"۔ دیکھا آپ نے مغرب والوں کی قابلیت اور دانش مندی، اپنی دانست میں (نعوذ باللہ) اس کتاب کی اصلاح شروع کر دی جسے وہ خود بھی خدا کی کتاب کہتے ہیں۔ انسان کی عظمت اور ترقی کا اس سے بڑا ثبوت کوئی پیش کر سکتے ہیں آپ؟

پچھلے دنوں امریکہ والوں نے (کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ لوگ ہیں) چھ عورتوں اور چھ مردوں پر مشتمل ایک اعلیٰ اختیارات کی حامل کمیٹی تشکیل کی تھی جسے بائبل کی غلطیاں درست کرنے کا فرض سونپا گیا تھا اور ان دانشور اور فاضل لوگوں نے سخت محنت شاقہ کے بعد یونانی بائبل اور عبرانی زبان میں لکھی ہوئی بائبل کا بغور مطالعہ کیا اور غلطیوں کی نشاندہی کی۔ بائبل تو عبرانی زبان میں لکھی ہوئی تھی اور بعد میں اس کا یونانی میں ترجمہ کیا گیا اور یہی دونوں کتابیں اس ضمن میں مستند اور قابلِ اعتماد مانی جاتی ہیں خیر بائبل کی نوک پلک درست کرنے کا فریضہ تو مغرب کے ترقی یافتہ لوگوں نے پہلے ہی شروع کر دیا تھا ظاہر ہے جب انسان زیادہ

ترقی کر جاتے تو ہر چیز کی اصلاح اور درستی کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے، باتیبل میں خاصی ترمیم (اور اضافے) کیے گئے مگر عورت اور مرد کے خالص جنسی نقطۂ نظر سے پہلے کبھی اس پر توجہ نہیں دی گئی مگر دیر آید درست آید۔ اب مغرب کے عقل مندوں نے باتیبل کو عورت مرد کی مساوات کے نقطۂ نظر سے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے قابلِ قبول بنانے کی کوشش کی ہے۔

گرجا گھروں کی نیشنل کونسل (C.C.C.) نے باتیبل پر نظرِ ثانی کرنے کے بعد ایسے تمام فقروں میں ترمیم کر دی ہے جن کے ذریعہ خدا کا مرد ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً خداوند کے لیے "لارڈ" کا لفظ یا HE کے طور پر خدا کا ذکر اب متروک ہو جائے گا، جہاں جہاں خداوند کے لیے "فادر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اب اس کی جگہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں گے جس سے خدا کے مرد ہونے کا اظہار نہ ہونے پائے۔ این سی سی کی طرف سے یہ ترمیم شدہ باتیبل کی دوسری جلد ہے، پہلی جلد قریباً ایک سال پہلے شائع کی گئی تھی۔ اگر خدا کے کلام میں ترمیم کی جا سکتی ہے تو پھر دوسرے سینٹ اس تصحیح سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے چنانچہ ان کے اقوال میں بھی ضروری تبدیلیاں کی گئی ہیں، مثلاً شادی کے بارے میں سینٹ پال کا کہنا ہے کہ "بیویوں کو اپنے شوہروں کی اسی طرح اطاعت کرنی چاہیے جس طرح خدا کی اطاعت کرتی ہیں"۔ اِس فقرے کو مکمل طور پر حذف کر دیا گیا ہے۔ سینٹ پال کے ان اقوال کو بھی قلم زد کر دیا گیا ہے جن سے محض عورتوں کا طوائف یا جسم فروش ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

یہودیوں کے لیے بھی اِن ترامیم میں خاصی "رعایت" کی گئی ہے، مثال کے طور پر عبرانی باتیبل میں جہاں خدا کی ذات کا تذکرہ آتا ہے وہاں پہلے یہ لکھا ہوا تھا کہ "ابراہیم کا خدا اور اسحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا"۔ اب ان تمام پیغمبروں کے ساتھ ساتھ ان کی ازواجِ مطہرات کا نام بھی درج کیا گیا ہے، جہاں خدا کے لیے "کنگ آف گلوری" کا لقب استعمال ہوتا تھا اب اس کی جگہ گلوریس حاکم کا لفظ استعمال ہوگا، جہاں خدا کے بیٹے کا تذکرہ ہے اب اس کی جگہ "خدا کی اولاد" لکھا جائے گا۔ "بیٹے" کا لفظ مساواتِ جنس کے برعکس ہے اِس لیے جس جگہ "بیٹے"

کا تذکرہ ہے اب وہاں "اولاد" اور "بچے" کے الفاظ استعمال کیے جائیں گے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان ترامیم کو یاد رکھنا بہت بڑی اکثریت کے لیے مشکل ہوگا اور پھر جن لوگوں نے پُرانی باتیبل یاد کی ہوتی ہے ان کی زبانوں پر نئے الفاظ چڑھنے میں کافی دقت لگے گی لیکن یہ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغرب کی خواتین نے اپنے مساویانہ حقوق کی جدوجہد کو کسی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ ہمارے ملک کی "ترقی پذیر" خواتین تو ابھی اسی بحث میں لگی ہوتی ہیں کہ عورت کی دیت کیا ہونی چاہیئے اور آیا عورت کی نصف شہادت جائز ہے یا سالم؛ لیکن یہ اندازہ آپ کو ضرور ہو سکتا ہے کہ جس گرم جوشی سے ہماری خواتین مرد عورت کے مساوی حقوق حاصل کرنے میں کوشاں ہے ایک دن اس کی تان کس جگہ جا کر ٹوٹے گی؟

کھیلوں کے مقابلوں کے دوران میں ہمارے ملک میں بھی تماشائی ہنگامہ آرائی کرتے ہیں۔ بعض اوقات توڑ پھوڑ اور فسادات بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک بار آسٹریلیا کے ساتھ پاکستان کے کرکٹ میچ کے سلسلے میں جب تماشائیوں نے شور و غل مچایا تو آسٹریلیا کی ٹیم نے بقایا میچ کھیلنے ہی سے معذوری ظاہر کر دی اور کراچی کا ایک روزہ میچ منسوخ کر دیا گیا، ہمارے نقادوں اور معتبر لوگوں نے تماشائیوں کے اِس طرزِ عمل کی پُرزور مذمت کی اور آسٹریلوی کھلاڑیوں کے فیصلے کو حق بجانب قرار دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آسٹریلوی ٹیم کا یہ طرزِ عمل انتہائی قابلِ اعتراض بلکہ غیر معقول تھا۔ بات یہ ہے کہ کھیلوں کے سلسلے میں ہنگامے اور توڑ پھوڑ جس کثرت سے اور جس وسیع پیمانے پر یورپ اور امریکہ میں رُونما ہوتے ہیں ہمارے ملک میں تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا۔ امریکی شہر ڈیٹرائیٹ میں گزشتہ مہینے ورلڈ سیریز کے مقابلوں کے سلسلے میں دس ہزار تماشائیوں نے مشتعل ہو کر میدان پر حملہ کر دیا۔ پولیس پر اور ایک دوسرے پر بوتلیں اور پتھر پھینکے، کاروں کو نذرِ آتش کر دیا۔ آس پاس کے گھروں کو لُوٹ کر آگ لگا دی۔ ایک کار کے ڈرائیور کو گولی مار کر کار ہی میں جلا دیا۔ ۱۴ افراد گرفتار ہوئے۔ درجنوں زخمی ہوئے اور ایک لاکھ ڈالر کا نقصان ہوا۔ اس سے ایک دن پہلے مین ہٹن کے فٹبال میچ

کے بعد بھی ایسا ہی ہنگامہ ہوا تھا اور بے شمار تماشائی اور پولیس والے زخمی ہوئے تھے۔
امریکی شہروں میں غوغا آرائی اب انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ سینکڑوں افراد زخمی ہو جاتے ہیں گھر لوٹ لیے جاتے ہیں، دکانوں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور تو اور کھلاڑیوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ جاتی ہیں مگر اس کے باوجود کسی ٹیم نے کبھی میچ کھیلنے سے معذوری ظاہر نہیں کی اور نہ ہی کوئی میچ منسوخ کیا گیا شاید مغرب والے اپنے ملکوں میں ہر عمل کو جائز اور ایشیا میں ہر کارروائی کو ناجائز تصور کر کے اس پر ناک بھوں چڑھانا لازمی سمجھتے ہیں۔ لطیفے کی بات یہ ہے کہ جو ٹیم ہار جاتی ہے محض اسی کے پرستار ہی بطورِ احتجاج ہنگامہ آرائی نہیں کرتے جیتنے والی ٹیم کے ہم نوا بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔

ماہرینِ نفسیات نے یہ تجزیہ کیا ہے کہ جیتنے والے تو احساسِ فخر اور کامیابی کے نشے میں آ کر توڑ پھوڑ کرتے ہیں اور ہارنے والے ظاہر ہے کہ مایوسی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے یہ حرکتیں کرتے ہیں گویا دونوں صورتوں میں مار پیٹ اور توڑ پھوڑ لازمی ہے۔ ماہرینِ نفسیات کا یہ خیال بھی ہے کہ کھیل کے میدانوں میں شراب کی بآسانی فراہمی بھی اس طرزِ عمل کا سبب بن جاتی ہے اس لیے اب اسٹیڈیم کے اندر اور گرد و نواح میں شراب کی فروخت ممنوع قرار دینے کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے۔

مصنوعات اور حبّ الوطنی

کسی زمانے میں محض غریب اور پسماندہ ملک ہی دوسرے ملکوں کی مصنوعات استعمال کیا کرتے تھے۔ کسی بھی قوم کے لیے یہ ایک اہانت اور کمتری کی بات سمجھی جاتی تھی کہ وہ دوسرے ملکوں سے اشیائے ضروریات درآمد کرے۔ یا پھر جو ملک بیرونی طاقتوں کے غلام تھے وہ مجبوراً حاکموں کی فراہم کردہ اشیا استعمال کیا کرتے تھے۔ ملکی صنعتوں کی موجودگی میں یہ نوآبادیاں پوری قوم کے لیے منڈیوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جو ملک ترقی یافتہ تھے وہ بھی اس ضمن میں انتہائی حساس تھے۔ دوسرے ملکوں کی مصنوعات کو نظرانداز کر کے ملکی مصنوعات کی سرپرستی کرنا حبّ الوطنی کا تقاضا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سالہا سال تک محبِ وطن انگریز، جرمنی یا فرانس کی مصنوعات استعمال کرتے ہوتے ہچکچاتا تھا۔ دوسری طرف جرمنوں کا بھی یہی حال تھا۔ ایک بار ہم چند جرمنوں کے ساتھ لندن سے پیرس گئے۔ دورانِ سفر ریل گاڑی میں خاصی ملاقات اور شناسائی بلکہ بے تکلفی ہو گئی۔ یہ جرمن تمام راستے فرانس اور انگریزوں پر نکتہ چینی کرتے رہے۔ دوسرے کمپارٹمنٹ میں فرانسیسی اسکول کے بچے بھی ہم سفر تھے اور بے حد شور و غل مچا رہے تھے ان کی ٹیچرز ہمارے کمپارٹمنٹ میں تھیں مگر بچوں کی شرارتوں اور گستاخیوں کے آگے بے بس نظر آتی تھیں۔ ایک جرمن نے بڑے کٹیلے لہجے میں فرانس کی ٹیچر سے کہا۔

"میڈم! یہ آپ کی نئی نسل ہے؟ کیا یہی لوگ آگے چل کر آپ کی قوم کی عنانِ حکومت اور ذمہ داریاں سنبھالیں گے؟"

میڈم کچھ شرمسار تھیں۔ دبی زبان میں بولیں "موسیو یہ ابھی بچے ہیں۔ سمجھدار ہوں گے تو سنبھل جائیں گے۔" جواب میں جرمن ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ تاثر یہ تھا کہ یہ بھلا خاک سنبھلیں گے۔

اتفاق سے یہ جرمن پیرس میں ہمارے ہی ہوٹل میں مقیم ہوتے اور جب مسلسل دو دن تک ان میں سے ایک صاحب بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ نظر آتے رہے تو ہم نے ان سے مذاقاً پوچھا۔

"حضرت کیا قصہ ہے آپ داڑھی رکھنا چاہتے ہیں؟"

وہ بولے:

"ایسا تو کوئی ارادہ نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں صرف جرمنی کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرتا ہوں اور یہاں مجھے جرمن شیونگ کریم ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی۔"

دو دن بعد وہ کسی دکان سے ایک جرمن شیونگ کریم تلاش کر کے لے آئے اور اپنی نوزائیدہ داڑھی کو اس کی نذر کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۷۰ء کا ہے اور مجھے آج بھی اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہے۔ جرمنوں کی حُبّ الوطنی اور جذبۂ قومیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔

جو ملک بدیسی طاقتوں کے محکوم تھے وہاں حاکموں کی تیار کردہ مصنوعات کی بھرمار ہوا کرتی تھی، جیسے غیر منقسم ہندوستان میں "میڈ اِن انگلینڈ" کے سوا کوئی اور چیز ہی نظر نہیں آتی تھی، ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ہمیں محکوم ہی اِس لیے بنایا تھا کہ ہمارے وسائل سمیٹ لیں اور اپنی مصنوعات کے لیے ہمیں منڈی بنائیں۔ لیکن جب آزادی کی تحریکوں

نے زور پکڑا تو یہ مہم بھی زور پکڑ گئی کہ "قومی مصنوعات استعمال کرو" گاندھی جی کا چرخہ اور کھدر کا پرچار بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس طرح ہندوستانیوں میں بھی یہ جذبہ بیدار کیا گیا کہ مقامی اور ملکی طور پر بنائی ہوئی مصنوعات کے استعمال کو ترجیح دو۔ ایک بھارتی فلم کا گانا بھی ایک زمانے میں بہت مشہور اور مقبول ہوا تھا۔

میرا جوتا ہے جاپانی
میرا کوٹ انگلستانی
سر پہ لال ٹوپی روسی
دِل ہے پھر بھی ہندوستانی

یہ گانا درحقیقت غیر ملکی اشیا۔ استعمال کرنے والوں پر ایک طنز ہے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ملک میں تیار کی ہوئی اشیاء کو ترجیح دینا اور غیر ملکی اشیاء کو نہ استعمال کرنا ایک بدتر قومی خصوصیت تصور کی جاتی تھی۔ اس کا ایک اور ثبوت اس وقت ملا جب میں پہلی بار یورپ گیا۔ انگلستان میں دیکھا کہ ہر طرف برطانوی کاریں استعمال ہو رہی ہیں۔ باہر کی کاریں برائے نام ہی نظر آتی تھیں۔ اٹلی میں فیئٹ کی قطاریں دیکھنے میں آئیں جس طرف دیکھیے ساختہ اٹلی کاروں کے انبار لگے ہوتے ہیں سڑکوں پر کوئی دوسری کار خال خال ہی نظر آتی۔ فرانس میں دیکھا کہ پی جو اور رینالڈز کاروں کی بھرمار ہے۔ اِسی طرح جرمنی میں ہر طرف جرمن کاریں دوڑتی ہوئی نظر آئیں۔

لیکن اب منظر بدل گیا ہے۔ مثال کے طور پر کاروں ہی کو دیکھ لیجیے۔ یورپ۔ امریکہ کینیڈا میں یوں تو بیرونی کاریں خاصی تعداد میں نظر آتی ہیں۔ مگر جاپانی کاروں نے سب پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ یورپ، امریکہ، کینیڈا ترقی یافتہ علاقے ہیں۔ کاروں کی صنعت خود ان ممالک میں ترقی کی معراج پر ہے لیکن اس کے باوجود جاپانی کاروں نے مقامی کاروں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے جاپانی کاریں خریدتے ہیں حالاں کہ

حکومتیں ان پر بھاری ڈیوٹیاں اور ٹیکس لگاتی ہیں اور ان کی قیمت مقامی کاروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے پھر بھی جاپانی کاریں خریدنے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے۔ مَیں نے ایک امریکی سے پوچھا:

آپ کے مُلک کی کاریں اتنی اچھی ہوتی ہیں پھر مہنگے داموں جاپانی کیوں خریدتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔

"جاپانی، امریکی کچھ نہیں ہوتا۔ ہم تو اچھی چیز خریدتے ہیں۔ گاہک محض سروس دیکھتے ہیں۔"

اِس رجحان کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ امریکہ اور کینیڈا میں موٹر سازی کی صنعتیں اب اپنی حکومت سے کہہ رہی ہیں کہ انھیں جاپانی کاروں کے مقابلے میں تحفظ فراہم کیا جائے۔ گویا خریداروں میں قومی مصنوعات کو بیرونی مصنوعات پر ترجیح دینے کا جذبہ ہی موجود نہیں ہے۔ کہیے، کیسا انقلاب ہے؟ وہ قومیں جو ساری دُنیا کی معیشت کو تسخیر کرنے نکلی تھیں اب خود اپنے گھر میں بیرونی مصنوعات کے سیلاب کا شکار ہیں۔ کاروں ہی پر منحصر نہیں ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں ان دنوں ہر طرف غیر ملکی مصنوعات کی بھرمار ہے۔ دکانیں اور بازار بدیسی اشیاء سے بھرے ہوتے ہیں۔ شاپنگ سینٹرز میں اشیاء کی کمی نہیں ہے لیکن اگر آپ محض ملکی مصنوعات خریدنے کے خواہش مند ہیں تو آپ کو تلاش کرنا ہوگا، جوتے، کپڑے، بجلی کی اشیاء، کھانے، کھلونے غرض یہ کہ ہر قسم کی چیزیں بیرونی ممالک سے درآمد ہو رہی ہیں لیکن ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اب تو قومی اور مقامی یادگار چیزیں بھی بیرونی ممالک کی محتاج ہیں۔ سوونیئر ایسی چھوٹی موٹی سجاوٹ کی چیزیں ہوتی ہیں جو کسی بھی ملک کی شناخت سمجھی جاتی ہیں اور سیّاح جب کسی ملک میں جاتے ہیں تو یادگار کے طور پر اس ملک کا سوونیئر ضرور خریدتے ہیں لیکن اگر یہ یادگاری اشیاء بھی بیرونی ممالک سے بن کر آنے لگیں۔ تو اسے کیا کہیں گے؟

اب ذرا کینیڈا کی یادگاری اشیاء کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ ٹورنٹو شہر کے ایک سوونیئر اسٹور میں کینیڈا کا جھنڈا جاپان سے بن کر آیا ہے۔ اس کی قیمت ۲۹ سینٹ ہے۔ رائل کینیڈین گھڑسوار پولیس کا یادگاری مگ فرانس کا بنا ہوا ہے اس کی قیمت دو ڈالر ۹۸ سینٹ ہے۔ ایک اور سوونیئر انگلستان کا ساختہ ہے جس کی قیمت ۲ ڈالر ۹۸ سینٹ ہے، دکاندار سے سیّاح نے پوچھا۔

"یہ سب یادگاریں اور نشانیاں تو کینیڈا کی ہیں مگر تیار کسی اور ملک میں ہوتی ہیں یہ کیا بات ہے؟"

دکاندار نے کہا:

"کینیڈا میں بنائی جائیں تو یہ زیادہ مہنگی ہو جائیں گی اور سیّاح خریداری کم کریں گے۔"

ایک اندازے کے مطابق ٹورنٹو کے بازاروں میں کینیڈا کی یادگاری اشیاء کا ۷۰ فیصد حصّہ بیرونی ملکوں سے بن کر آتا ہے۔ ایک دکاندار نے بتایا کہ جناب چند سال پہلے تو حالت یہ تھی کہ وہ تمام سوونیئر جو سیّاح کینیڈا کی یادگاروں کے طور پر لے جاتے تھے بیرونی ممالک کے تیار کردہ ہوتے تھے اس کی ایک وجہ اس نے یہ بتائی کہ مقامی طور پر بنائی جانے والی اشیاء معیاری تو ہوتی ہیں مگر ان کی لاگت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ دکاندار اگر کینیڈین مصنوعات خرید کر دکانوں میں رکھیں تو مال فروخت نہیں ہوتا۔ مثلاً کینیڈا کے یادگاری چمچوں کی قیمت مقامی چمچوں کے مقابلے میں تین گنا ہے۔ دکاندار کو ہم نے قوم پرستی کا احساس دلایا تو وہ بولا:

"دیکھئے مسٹر! مَیں ایک اچھا قوم پرست ہوں۔ مجھے بیرونی ملکوں کی چیزیں خرید کر دکان میں رکھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر مجھے پیٹ بھی تو پالنا ہے۔" چھوٹے موٹے دکانداروں کی تو بات ہی کیا ہے۔ ایٹن جیسے عظیم الشان اسٹور میں بھی اب بدیسی مصنوعات

گھس آئی ہیں۔ تائیوان کے لباس، اٹلی کے جوتے، یوگوسلاویہ کے زنانہ شوز، کوریا کے تولیے، انگلستان اور ہانگ کانگ کی ٹائیاں، جاپان کے ٹرانزسسٹر، کیمرے وغیرہ، غرضیکہ دُنیا بھر کے ملکوں کی مصنوعات خرید لیجیے۔ سیّاح جب خریداری کرتا ہے تو وہ محض قیمت دیکھتا ہے۔ یہ دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ جس ملک میں وہ خریداری کر رہا ہے مصنوعات وہاں کی بنی ہوتی ہیں یا کسی دوسرے ملک کی؟

یہی عالم امریکہ اور یورپ کا ہے۔ امریکی شاپنگ سینٹرز بیرونی ممالک کی مصنوعات سے بھرے پڑے ہیں۔ جہاں تک ملبوسات کا تعلّق ہے خود امریکیوں میں یہ تاثّر عام ہے کہ ساختہ امریکہ ملبوسات دیرپا اور معیاری نہیں ہوتے۔ ملبوسات کے معیار اور فنیش کے لیے وہ یورپ کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر اب تو ہر قسم کی مصنوعات بیرونی ملکوں سے درآمد کی جا رہی ہیں اور امریکی شوق سے خرید رہے ہیں۔

انگلستان والوں کو اپنے جذبۂ قوم پرستی پر بہت ناز تھا۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ لندن کے بازار، جاپان، کوریا، تائیوان، ہانگ کانگ، اٹلی، یوگوسلاویہ کی مصنوعات سے بھرے پڑے ہیں۔ کئی بڑے اداروں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ سستی مزدوری اور کم لاگت کے پیشِ نظر کارخانے مشرقِ بعید میں قائم کر لیے ہیں۔ اور ان کی مصنوعات پر "میڈ اِن انگلینڈ" درج کر دیتے ہیں۔ لیکن بے شمار ایسی اشیاء بھی ہیں جن پر دوسرے ممالک کا نام درج ہوتا ہے اور انگریزوں کے جذبۂ حُبّ الوطنی کو مطلق ٹھیس نہیں پہنچتی۔ کاریں وغیرہ انگریز بھی غیر ملکی استعمال کرتے ہیں۔ شرابیں بھی باہر کی زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ ملبوسات خریدتے وقت بھی کوئی انگریز تائیوان، ہانگ کانگ یا کوریا کی مصنوعات پر ناک بھوں نہیں چڑھاتا۔

شاید آپ اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہمارے ملک میں جو لوگ مقامی مصنوعات کو ترجیح دینا پسند کرتے ہیں وہ بھی مذکورہ بالا واقعات کے پیشِ نظر حق بجانب ہیں مگر یہ نہ

بھولیے کہ جن ممالک کی مثالیں اوپر بیان کی گئی ہیں وہ انتہائی ترقّی یافتہ ممالک ہیں جن کی معیشت نہایت مستحکم ہے جن کی اپنی برآمدات بہت زیادہ ہیں۔ جن کی اپنی صنعتیں ترقّی کی معراج پر ہیں اور اب وہ اِس منزل پر ہیں کہ مقامی مارکیٹ میں تھوڑی بہت بیرونی ملکوں کی یلغار انھیں متاثّر نہیں کرتی۔ پاکستان کی صنعتیں ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ ہماری معیشت اتنی مستحکم نہیں ہے کہ بیرونی مداخلت کا مقابلہ کر سکے۔ اِس لیے ہمارے لیے حُبّ الوطنی اور جذبۂ قوم پرستی کا تقاضا ہے کہ اپنی مصنوعات کی سرپرستی کریں۔

نسلی تعصّب

نسلی علاقائی اور تہذیبی اختلاف دُنیا کے مختلف علاقوں میں جنگ و جدل اور تباہی کا باعث بن چکا ہے، ایشیا ہی نہیں یورپ اور امریکہ جیسے ترقّی یافتہ ممالک بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ اپنے ایک گزشتہ مضمون میں مَیں نے کینیڈا کے صوبہ کیوبک کا تذکرہ کیا تھا، یہ فرانسیسی نسل کے لوگوں کی اکثریت کا صوبہ ہے اور کیوبک کے باشندوں کی اکثریت کینیڈا کے دوسرے صوبوں کے برعکس ایک نئی راہ پر گامزن ہے۔ اس صوبے میں محض فرانسیسی کو سرکاری اور قومی زبان قرار دے دیا گیا ہے، حد یہ ہے کہ انگریزی زبان میں دکانوں کے سائن بورڈ لکھنا بھی قانونی طور پر جُرم اور قابلِ تعزیر قرار دے دیا گیا ہے۔ کیوبک کی حکومت بھی اپنی پالیسی میں انتہا پسند ہے، عوام تو خیر ہیں ہی انگریزوں اور انگریزی کے مخالف (جو باقی ماندہ ۹ صوبوں میں سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے) لیکن ایک مہذّب اور تعلیم یافتہ معاشرے اور غیر مہذّب اور غیر تعلیم یافتہ معاشرے میں جو فرق ہوتا ہے اس کا کھلا ثبوت کیوبک اور کینیڈا کے حالات فراہم کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے عقائد اور خیالات میں انتہا پسند سہی مگر اس کے باوجود ان کے اظہار کا طریقہ مختلف ہے۔ ایک طرف فرانسیسی اکثریت ہے جو انگریزی کو دیس نکالا دینے پر تُلی ہوتی ہے بلکہ کینیڈا کے دوسرے حصّوں کے عوام میں یہ تو یہ تاثّر بھی عام ہے کہ کیوبک کے صوبے کو

خود مختار قرار دے کر اس کو فرانس کے ساتھ ملحق کرنے کی ایک مہم بھی درپردہ چلائی جا رہی ہے اِس کے باوجود کینیڈا کی وفاقی حکومت اور کینیڈا کے دوسرے صوبوں کے لوگ جس قوتِ برداشت، تحمّل اور رواداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں وہ دوسروں کے لیے ایک مثال بن سکتی ہے۔

مونٹریال صوبہ کیوبک کا دارالحکومت ہے میرے قیام کینیڈا کے دوران مجھے اخبارات کے ذریعہ پتہ چلا کہ کیوبک میں انگریزی کے خلاف منظّم محاذ بنایا جا رہا ہے۔ مگر مونٹریال جانے کے بعد ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کیوبک کے فرانسیسی باشندے اپنی انگریز دشمنی میں کتنے آگے نکل چکے ہیں۔ مونٹریال کینیڈا کے دوسرے شہروں سے یکسر مختلف شہر ہے۔ اپنے ماحول، مزاج، رکھ رکھاؤ اور شکل و صورت کے اعتبار سے یہ فرانس کا کوئی شہر لگتا ہے۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس میں ایک نزاکت اور شائستگی بھی ہے۔ جو فرانس والوں کے مزاج کی آئینہ دار ہے مگر مونٹریال میں سب سے زیادہ جو چیز متاثّر کرتی ہے وہ یہاں کے در و دیوار اور گلی کوچوں سے انگریزی کی غیر موجودگی ہے۔ ٹورنٹو کینیڈا کا سب سے بڑا شہر ہے، صوبہ اونٹاریو کا صدر مقام بھی ہے۔ کینیڈا کے دوسرے شہروں کی طرح اس شہر میں بھی انگریزی اور فرانسیسی شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔ لیکن مونٹریال کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں انگریزی تبرّک کے طور پر بھی دیکھنے کے لیے نہیں ملتی۔ آبادی کی اکثریت ایسی ہے جو انگریزی سے قطعاً نابلد ہے اور صرف فرانسیسی زبان جانتی ہے، دوسری طرف صوبائی حکومت کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ "انگریزی استبداد" کی ہر نشانی کو مٹا دینا چاہتی ہے۔ پہلے تو حکومت نے انگریزی زبان میں سائن بورڈ لکھنے پر پابندی عائد کی تھی مگر اب ایک قدم اور آگے نکل گئی ہے اور فرانسیسی زبان میں لکھے ہوئے سائن بورڈ سے انگریزی کے الفاظ بھی حذف کرنے کے لیے کوشاں ہے، مثلاً ایک دکان دار سے کہا گیا کہ وہ اپنے سائن بورڈ سے لفظ "مارکیٹ" خارج کر دے کیونکہ یہ انگریزی لفظ ہے۔ اِس انتہا پسندی کا نتیجہ اب برآمد ہو رہا

ہے۔ انگریزی کے بہی خواہوں اور انگریز نسل کے لوگوں نے اب صوبہ کیوبک سے نقل وطن کرکے ملک کے دوسرے صوبوں کا رُخ کر لیا ہے بہت سی بڑی بڑی کمپنیاں اپنے صدر دفاتر اور کارخانے وغیرہ کیوبک سے منتقل کر رہی ہیں۔ چھوٹے دکانداروں کا تو ذکر ہی کیا ہے وہ تو پہلے ہی بیزار ہو کر ٹورانٹو اور دوسرے شہروں میں جا بسے ہیں۔ کاروباری حلقوں پر حکومت نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس صوبے کی سرکاری زبان محض فرانسیسی ہوگی۔ حد تو یہ ہے کہ دکانداروں نے حکومت کے ڈر سے اپنی دکانوں سے لفظ "EXIT" بھی ہٹا دیا ہے، ایک ماہر آرائش کو حکومت نے ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی دکان کا نام "لیک شور ڈیکور" سے تبدیل کر کے حکومت "ڈیکور بورڈ ڈو لیک" کر دے کیونکہ یہ مکمل فرانسیسی لفظ ہے۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیوبک کی حکومت انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال کرنے کی مخالف ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ بعض بڑی انگریزی کمپنیوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے کمپیوٹرز میں بھی فرانسیسی زبان استعمال کریں۔ ان کا عذر یہ ہے کہ کمپیوٹر تو ایک ہی زبان بولتا ہے۔ فرانسیسی الفاظ اس کے اندر کس طرح ٹھونسے جا سکتے ہیں؟ صوبہ کیوبک کی حکومت کی "صرف فرانسیسی" کی پالیسی نے کاروبار اور بزنس کو بُری طرح متاثر کیا ہے سالہا سال سے کیوبک میں مصروف کاروباری ادارے اب ٹورانٹو اور دوسرے شہروں میں پناہ لے رہے ہیں۔ مبصرین کا خیال ہے کہ یہ پالیسی صوبہ کیوبک کی معیشت کو بہت بُری طرح متاثر کرے گی۔ آبادی کا ایک طبقہ اس پالیسی کو "نسلی منافرت" قرار دے رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ کلچر کے نام پر یہ دراصل نسلی منافرت کی مہم چلائی جا رہی ہے جس کا اثر پورے کینیڈا پر ہوگا اور بہت خراب ہوگا۔ یہ پیش گوئی درست ہی ثابت ہونے لگی ہے۔ ثبوت میں مونٹریال کے غیر آباد علاقے اور سڑکیں دیکھ لیجیے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ لاکھوں افراد مونٹریال سے بوریا بستر گول کر چکے ہیں جبکہ نئے آنے والوں کی تعداد بمشکل چند ہزار ہے۔ قریب قریب ۱۲۸ بڑی کمپنیاں یا تو مونٹریال سے بالکل

رخصت ہو گئی ہیں یا انھوں نے یہاں اپنا کاروبار محدود کر لیا ہے۔ اس کا اثر بے روزگاری پر بھی پڑ رہا ہے اور ہزاروں افراد بے کار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ۶۲۹ کے قریب کمپنیوں نے اپنے صدر دفاتر کو مونٹریال سے منتقل کر دیا ہے۔

مگر کیوبک کے انتہا پسند کہتے ہیں کہ "ناپسندیدہ عناصر" کا صوبے سے رخصت ہو جانا ہی بہتر ہے، اِس مہم کا انجام بالآخر کیا ہوگا؟ یہ فیصلہ تو مستقبل ہی کرے گا۔ مگر اس معاشرے کی یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ اپنے لسانی اور ثقافتی اختلافات حل کرنے کے لیے ان لوگوں نے بیشتر ایشیائی ملکوں کے عوام کی طرح قتل و غارت اور آگ اور خون کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

ہمارے کینیڈا کے زمانۂ قیام میں دو اور واقعات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو شہزادہ چارلس اور ان کی بیگم ڈیانا کا (بمعہ کمسن بچّے کے) دورۂ کینیڈا اور دوسرا سابق باکسر محمد علی کا دورہ انگلستان۔ مَیں نے ایک بار پہلے بھی لکھا تھا اور اب اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ انگلستان والوں نے اپنی اقتصادی پسماندگی، معاشی بدحالی، سیاسی چپقلش اور دوسری تمام کوتاہیوں کا واحد حل دریافت کر لیا ہے اور وہ ہے ڈیانا۔ ڈیانا کو ایک گلیمر کوئین کے طور پر دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے اور جس طرح کسی زمانے میں ہالی وڈ کے فلم ساز جانے بوجھے منصوبے کے مطابق "اسٹارز" کی پبلسٹی کیا کرتے تھے اسی انداز سے برطانیہ نے ڈیانا کو ساری دُنیا کے سامنے گلیمر، حسن و جمال، سادگی اور شہزادگی کا جیتا جاگتا نمونہ بلا کر پیش کیا ہے اور اپنے اس مقصد کے حصُول میں بہت حد تک کامیاب رہا ہے۔ ڈیانا یورپ کے معیارِ حسن کے لحاظ سے ایک معمولی خاتون ہیں مگر اخباری تشہیری مہم نے انھیں ایک "مافوق الفطرت ــ" کردار کے طور پر دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے جو اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستی ہے۔ اس کی ہر نقل و حرکت ساری دُنیا کے لیے دلچسپی اور دلکشی کی حامل ہے یہاں تک کہ جس طرح سابق امریکی صدر کینیڈی ایک زمانے میں اپنی

بیگم جیکولین کی پبلسٹی کیا کرتے تھے اِسی طرح شہزادہ چارلس بھی اپنی بیگم کی تعریف و توصیف کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ صدر کینیڈی پہلی بار فرانس کے دورے پر گئے تو جیکولین کی سحر انگیز شخصیت کی پبلسٹی ان سے پہلے فرانس پہنچ چکی تھی جب صدر کینیڈی پیرس پہنچے تو انھوں نے ہزاروں صحافیوں اور فوٹو گرافوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"خواتین و حضرات! مَیں وہ شخص ہوں جو جیکولین کی ہمراہی میں آپ کے سامنے حاضر ہوا ہے۔"

فرانس کے لوگ صدر کی اِس ادا پر لوٹ پوٹ ہو گئے، کچھ اسی قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ شہزادہ چارلس نے بھی دورۂ کینیڈا کے دوران کیا، اخبارات اور ٹی وی تو پہلے ہی شہزادی ڈیانا کے حسن و جمال کے قصیدے گا رہے تھے۔ شہزادہ چارلس تشریف لائے تو آتے ہی انھوں نے صحافیوں سے پوچھا۔

"خواتین و حضرات کیا خیال ہے؟ ڈیانا حسن و رعنائی کا مجسمہ ہے یا نہیں؟"

اِسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ دورے میں جہاں بھی گئے اپنی بیگم کے پہلو سے چپکے رہے، ان کی باہنوں میں باہنیں ڈالے رہے اور لوگوں سے اپنی بیگم کی رعنائی کی داد وصول کرتے رہے یہاں تک کہ اخباروں نے لکھا۔

"ڈیانا ایسی ساحرہ ہے جس نے انگلستان کے ولی عہد کو بندۂ بے دام بنا لیا ہے۔ وہ پبلک کے سامنے بھی اپنی پری جمال بیوی سے دُور رہنا گوارا نہیں کرتا۔"

کینیڈا میں ڈیانا اور شہزادہ چارلس جہاں بھی گئے ڈیانا کے پرستار ٹوٹ پڑے۔ برطانیہ کی ڈپلومیسی فاک لینڈ میں ہار گئی مگر ڈیانا کی شکل میں انگلستان نے ساری دُنیا کو جیت لیا ہے۔ آج کی تشہیر پسند دُنیا میں کسی بھی ملک کے لیے ڈیانا جیسی دل کش اور سحر انگیز شخصیت ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ پبلسٹی کے مارے ہوتے لوگ مشہور

چہروں کے گلیمر کے آگے دوسرے تلخ حقائق کو پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں۔ زمانۂ حاضر میں انگلستان کے پاس ڈیانا سب سے موثر اور کار آمد ہتھیار ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے

معاشی اور اقتصادی طور پر پسماندہ ملکوں میں سیاحت کے نام پر فحاشی خصوصاً جسم فروشی اور عصمت فروشی جس تیزی سے پھیل رہی ہے اس کا تذکرہ میں نے مشرقِ بعید خصوصاً سری لنکا اور تھائی لینڈ کے حالیہ سفر کے بعد کیا تھا۔ فلپائن بھی اِس ضمن میں ان دونوں ملکوں سے پیچھے نہیں ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی اور دلبستگی کے لیے مغربی ملکوں میں بھی جنس کو ایکسپلائٹ کیا جاتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مغرب میں جنس اور عصمت کا تصوّر ہی مشرق سے مختلف ہے۔ مغربی معاشرہ عورت کی آبرو اور عصمت کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا جب کہ مشرق میں لوگ اس کی خاطر جانیں نچھاور کر دیتے ہیں۔ بے شمار قتل اور خون ریز جھگڑے محض اس بنا پر رونما ہوتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مغرب میں ایسی بے روزگاری اور غربت کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا جو مشرقی ملکوں کا مقدّر بن چکی ہے۔ بڑے شہروں میں ملازمت اور جسم فروشی واحد کاروبار ہے جو دیہات سے آنے والے لاکھوں افراد کا ذریعۂ معاش ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مذکورہ ملکوں میں عورتوں کی آبادی بھی مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور تعلیم، ہُنرمندی بھی عام نہیں ہے۔ اِس لیے جب ہزاروں کی تعداد میں لڑکیاں دیہات سے شہروں کا رُخ کرتی ہیں تو وہ کسی بھی قسم کے ہُنر اور تربیت سے عاری ہوتی ہیں۔ ان کے لیے شارٹ کٹ یہی ہے کہ اپنا جسم فروخت

کریں۔ شہروں کا رُخ کرنے سے پہلے وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیّار ہوتی ہیں۔ پھر جب شہروں میں نہایت منظّم کاروباری گروہ ان کی مشکل کشائی کی غرض سے موجود ہوں اور ترغیب و تحریص کے تمام حربے بروئے کار لائے جائیں تو پھر ان بے بس لڑکیوں کو اس کے سوا کوئی دوسری راہِ نجات نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ بنکاک اور منیلا اور اب کسی حد تک کولمبو بھی اس راہ پر چل نکلا ہے، سیاحوں کی دلبستگی کے بڑے مرکز بن گئے ہیں سیاحوں کو ان مقامات پر نہایت ارزاں جنس دستیاب ہو جاتی ہے۔ ارزانی کا سبب بھی وہی ہے۔ یعنی مانگ اور فراہمی کا عدم تناسب۔ جس چیز کی مانگ کم ہو اور فراہمی بہت زیادہ، ظاہر ہے کہ اس کی قیمت بازار میں گر جاتے گی۔ بنی نوعِ انسان کے ساتھ بھی یہی المیہ رونما ہُوا ہے۔ آبادی بے اندازہ بڑھتی جا رہی ہے۔ وسائل اور ذرائع نہایت محدود ہیں۔ اور ضروریاتِ زندگی روز بروز گراں تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اِس پر طرّہ یہ کہ لوازماتِ زندگی کی فہرست روز بروز طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں پسماندہ اور غیر ترقّی یافتہ معاشرے ناہمواری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ سفر تو میں نے کیا ہے مغرب میں اور مسائل بیان کر رہا ہوں مشرق کے۔ اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے اور یوں بھی اگر زیادہ گہرائی میں جاکر مطالعہ کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ آج مشرق جن عوارض اور مسائل کا شکار ہے ان کے اسباب و عوامل کا ذمّہ دار بھی مغرب ہے اور پھر لُطف کی بات یہ ہے کہ ان حالات پر اظہارِ ہمدردی بھی مغرب کے حلقوں میں کیا جاتا ہے اور ہمارے مشرقی دانشور ان مسائل کے حل کے لیے مغرب سے نسخہ تلاش کرتے ہیں ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں!

بات یہ ہوئی کہ میرے قیامِ کینیڈا کے دوران میں وینکوور میں عالمی کونسل اور چرچ کا

اجتماع ہُوا۔ موضوع گفتگو تھا "تیسری دُنیا کے ملکوں میں جسم فروشی اور طوائفیت کی بڑھتی ہوئی دبا اور عورتوں کا استحصال"۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے ان ممالک میں جسم فروشی کا دھندا شروع کرانے والے بھی اہلِ مغرب تھے۔ پہلے جنگوں کے زمانے میں ان ممالک کو فوجیوں کی تفریح گاہ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا کیا گیا کہ یہ نہایت آسان اور کم خرچ دھندا ہے جس کے لیے انسانوں کے سوا کسی اور خام چیز کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ پھر جب امریکی اور انگریز فوجیوں کی تعداد کم ہونے لگی تو مغرب سے سیاحوں کے غول کے غول سیر و تفریح کے بہانے نازل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ علاقے "سیاحوں کی جنّت" بن گئے۔ بدقسمتی سے ان میں سے کسی علاقہ میں بھی صحیح معنوں میں عوامی حکومتیں برسرِ اقتدار نہیں ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگوں کی کسمپرسی اور بے بسی بلکہ ذلت و اہانت کے بارے میں کسی نے سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی بلکہ اس کاروبار کو معاشی ترقی کے لیے فال نیک سمجھ لیا گیا اور اب ان ہی مسائل پر غور کرنے کے لیے دُور دراز مغرب کے شہر ڈینکوئر میں عالمی گرجاؤں کی کونسل کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا جس میں تیسری دُنیا کی "مجبور" عورتوں کے استحصال کے بارے میں غور کیا جا رہا تھا۔

اب ذرا اس اجلاس کی کارروائی ملاحظہ فرمایئے۔ تھائی لینڈ میں قائم شدہ ایک ایجنسی کے سربراہ پیٹر ہولڈن نے اجلاس کو بتایا کہ ترقّی پذیر ملکوں میں جسم فروشی ایک انتہائی نازک مسئلہ بن چکی ہے۔ اِس کا سبب انھوں نے بھی وہی بتایا جو میں لکھ چکا ہوں۔ یعنی غربت زدہ اور پسماندہ دیہات سے لوگوں کا شہروں کی طرف کوچ۔ ان کے بیان کے مطابق دیہات سے آنے والے مرد اور عورت جاہل، کندہ ناتراش اور ہر قسم کے ہُنر سے عاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کو اپنا پیٹ پالنے کے لیے وہی شے فروخت کرنا پڑتی ہے جو اُن کو میسّر ہے یعنی جسم۔ اگر اُن کے پاس کوئی اور چیز ہو تو وہ جسم فروشی پر مجبور نہ ہوں مگر دیہات میں تو انھیں رشتۂ حیات قائم رکھنے کے لیے

پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی، تعلیم اور ہُنرمندی کی تربیت کا کیا سوال ہے؟ آبادی بہت زیادہ ہے۔ شہر کی طرف ہجرت کرنے والا ہر شخص اور ہر لڑکی اپنے پیچھے کنبوں کے درجنوں افراد کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اِن بوڑھے، ناتواں، کمزور اور بھوکے بچّوں کی کفالت کا واحد سرمایہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو شہروں میں جا کر کام کرتے ہیں جیسے تیسے اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور آمدنی کا بڑا حصّہ دیہات میں بھیج دیتے ہیں۔

اجلاس میں سیاحت کے ایک ادارہ کے سربراہ نے بتایا کہ دیہات سے آنے والی ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کو سیاحت کے ادارے "فروغِ سیاحت" کے نام پر اُچک لے جاتے ہیں۔ اور حکومتیں بھی خوش ہو کر ان کے ساتھ تعاون کرتی ہیں۔ کیونکہ سیاحت کے اداروں کے طفیل بے شمار سیّاح ان ممالک کی معیشت کو بہتر بنا رہے ہیں۔ اجلاسوں میں بعض روح فرسا انکشاف بھی کیے گئے۔ تھائی لینڈ کی ایک نرس نے بتایا کہ اس ملک میں جنس ایک عام شے بن چکی ہے اور سیاحت کی کمپنیاں ہزاروں سیّاحوں کو ٹولیوں کی صورت میں لاتی ہیں جن کی تعطیلات کا بیشتر وقت ملک کو دیکھنے میں نہیں بلکہ ہوٹلوں کے بند کمروں میں گزرتا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے ایئرپورٹ اور ہوٹل کے علاوہ کوئی تیسری جگہ تک نہیں دیکھی ہوتی۔ نہ انھیں اِس کی مہلت ملتی ہے نہ وہ اس کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ یہ لوگ محض جسمانی آسائش کے لیے اِن علاقوں کا رُخ کرتے ہیں۔ درجنوں بلکہ سینکڑوں نہایت منظّم ادارے ہر رنگ و نسل کی جنس فراہم کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ تھائی لینڈ کی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس ملک میں جسم فروشی اور طوائف نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ کہتے ہے ناچشم پوشی اور خود فریبی کی انتہا۔

سیاحت کے ان طریقوں سے محض ان علاقوں کے ادارے ہی فائدے نہیں اُٹھاتے مغرب کے تاجر بھی خوب ہاتھ رنگتے ہیں مثلاً ہوائی کمپنیاں، ٹریول کمپنیاں، سیاحت کے

ادارے۔ بے حسی کا اندازہ اِس بات سے لگائیے کہ یورپ اور امریکہ میں ان علاقوں کی سیاحت کے سلسلے میں جو پمفلٹ تیار کیے جاتے ہیں ان میں کھلے عام یہ بھی درج ہوتا ہے کہ بنکاک اور منیلا میں آپ اپنی جنسی ضروریات نہایت سستے داموں پوری کر سکتے ہیں۔ بہت سے ادارے انھیں "سیکس ٹورز" کا دلفریب نام دیتے ہیں۔ یہی نہیں بنکاک میں شادی کے لیے بھی رشتے دستیاب ہوجاتے ہیں۔ گویا مختلف ناموں سے اور مختلف بہانوں سے عیاشی کا دھندہ چلایا جارہا ہے۔

فلپائن میں ایک ڈاکٹر ارامینڈا نے بتایا کہ ان کے ملک میں جسم فروشی قانونی طور پر ممنوع ہے لیکن تھائی لینڈ کی طرح یہاں بھی یہ کاروبار عروج پر ہے۔ اِس کاروبار کی رونق کا مستقل اور بڑا سبب اِس ملک میں واقع دو امریکی فوجی مراکز بھی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان ممالک میں اِن خرابیوں کی روک تھام کے لیے اقدامات بھی نہیں کیے جارہے اِس لیے مقامی حکام اسے "سیاحت اور ترقی" کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ جسم فروشی ایک ایسی خرابی ہے جس کے شاخسانے کے طور پر منشیات اور جرائم کا فروغ بھی ہوتا ہے اور اِن چیزوں کا سب سے پہلا نشانہ گھریلو اور خاندانی زندگی بنتی ہے۔ رشتوں کی تمیز اور پہچان ختم ہوجاتی ہے، معاشرتی اقدار دم توڑ دیتی ہیں۔ خاندان اور کُنبے تتر بتر ہوجاتے ہیں۔ اس کاروبار میں عیشت کا پہلو دیکھ کر پورٹو ریکو، جنوبی امریکہ اور شمالی افریقہ سے بھی طائفیں بہت بڑی تعداد میں "درآمد" کی جاتی ہیں۔

دیکھا آپ نے؟ مغرب میں تو سیاحت سے دکاندار، ہوٹل والے، ہوائی کمپنیاں، ٹرانسپورٹ کمپنیاں، تفریح گاہیں اور مقامی صنعتیں فروغ پاتی ہیں اور مشرق میں محض جسم فروشی، منشیات اور جرائم۔

ڈیڑھ سال قبل مَیں نے امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کیا تھا تو وہاں اقتصادی حالات دگرگوں تھے۔ بے روزگاری اور مہنگائی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کاروں کی صنعت کسمپرسی

شکار تھی اور بہت سی کارساز کمپنیاں خسارے میں جارہی تھیں۔ ہم اہلِ مشرق اِن خبروں کو سُن کر مطمئن تھے کہ غُربت اور بے روزگاری صرف ہمارا ہی مقدّر نہیں ہے۔ امریکہ جیسا ملک بھی اِس کی زد میں ہے۔ مگر اُن دنوں جب مَیں نے امریکہ کینیڈا اور انگلستان کا سفر کیا تو یہ احساس ہوا کہ باعمل اور زندہ اقوام اور بے عمل اقوام کے مابین کیا فرق ہے؟ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال کے دوران میں بے روزگاری اور مہنگائی پر قابو پانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ نقصان میں چلنے والی صنعتوں کو سنبھالا ملا ہے۔ بے روزگاری کم ہوگئی ہے۔ صنعتی ترقّی میں اضافہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر کاروں کی صنعت ہی کو دیکھ لیجیے۔ ایک وقت تھا کہ جب امریکی کارساز حکومت سے مطالبہ کر رہے تھے کہ انھیں جاپانی کاروں سے تحفظ دیا جائے۔ مگر اس واویلا کے ساتھ ہی وہ عملی اقدامات میں بھی مصروف تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہم جو شمالی امریکہ گئے تو حالات کافی بدلے ہوئے تھے۔ نوکریاں آسانی سے ملنے لگی ہیں۔ کاروں کی تعداد بڑھ گئی ہے مہنگائی بھی بڑھ گئی ہے۔ مگر پٹرول کی قیمت کم ہوگئی ہے۔ بہت سی کھانے پینے کی چیزیں بھی سستی ہوگئی ہیں۔ جب کہ ہمارے مُلک میں سب کچھ برعکس ہوا ہے۔ پٹرول ساری دُنیا میں سستا مگر ہمارے ہاں مہنگا ہوگیا ہے۔ کھانے کی اشیاء انتہائی مہنگی ہوگئی ہیں حیرت ہے کہ انڈے ان دنوں پاکستان میں نو دس روپے درجن ہیں جبکہ گرمی کا موسم ہے۔ اندازہ لگا لیجیے کہ موسم سرما میں ان کا نرخ کیا ہوگا۔ اِس کے مقابلے میں انڈے ان دنوں کینیڈا، امریکہ میں قریباً اسی قیمت کے ہیں یا سستے ہیں۔ وہاں ڈبل روٹی، دودھ وغیرہ کی قیمتیں بھی زیادہ نہیں بڑھی ہیں۔ پھل، ترکاری کے نرخ بھی ڈیڑھ دو سال میں زیادہ نہیں بڑھے جبکہ ہمارے ہاں ان اشیاء کے نرخوں نے چھلانگیں بلکہ لانگ جمپ اور ہائی جمپ لگائی ہے۔ کاروں کی صنعت امریکہ اور کینیڈا میں قومی معیشت کا بیرومیٹر سمجھی جاتی ہے۔ اِس کا احوال یہ ہے کہ پچھلے تین ماہ کے دوران امریکہ کے تین [illegible]

کارساز اداروں نے دو ارب ڈالر کا منافع کمایا ہے۔ اِن اداروں کی منفعت کے ساتھ ساتھ یہاں روزگار میں بھی اضافہ ہُوا ہے۔ کارکمپنیاں عموماً اچھے معاوضے دیا کرتی ہیں اور ہُنرمندوں اور کاریگروں کو تو بہت ہی اچھے معاوضے دیتے جاتے ہیں۔ ایک غیر تربیت یافتہ شخص کو عام طور پر بارہ تیرہ ڈالر (کینیڈین) فی گھنٹہ مل جاتا ہے گویا ایک دن کا معاوضہ قریب قریب سو ڈالر (بشرطیکہ صرف آٹھ گھنٹے کام کیا جائے اور اوورٹائم کی صورت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے) اس طرح ہفتے کے چھ دن کا معاوضہ کم سے کم چھ سو ڈالر یعنی ۲۴ سو ڈالر مہینہ ہوگیا۔ اِس صورت میں ہے جب اوورٹائم نہ کیا جائے اور ہفتے میں صرف چھ روز کام کیا جائے۔

ماہرینِ اقتصادیات نے اندازہ لگایا ہے کہ شمالی امریکہ میں صنعتی بحالی کے باوجود روزگار میں بہت زیادہ اضافہ نہیں ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۳ء میں بے روزگاری ۱۳٫۳ فیصد ہے مگر ۱۹۸۴ء میں ساڑھے گیارہ فیصد رہ جائے گی۔ لیکن ایک بات نہ بھولیے۔ یورپ اور امریکہ میں بے روزگاری کا مطلب وہ نہیں ہے جو ہمارے ملک میں یا مشرقی ممالک میں ہے۔ بیروزگاری کے دوران میں بھی لوگوں کو وظیفہ ملتا رہتا ہے اور یہ وظیفہ ان کی اوسط آمدنی کے برابر ہوتا ہے۔ وہاں کے بے روزگار کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اسے مطلق کام نہیں مل رہا۔ اس کی پرابلم یہ ہے کہ وہ اپنی پسند اور اپنے معیار کے مطابق روزگار نہیں حاصل کر سکا اِس لیے بے کار ہے۔ چنانچہ حکومت اسے بے روزگاری کے ایام میں وظیفہ دینے کی پابند ہے۔ ہمارے ایک پاکستانی دوست کو کینیڈا میں ہر ہفتہ دو سو دس ڈالر بے روزگاری الاؤنس مل رہا تھا جبکہ ان کی ایک بہن کو قریباً ایک سو بیس ڈالر ہفتہ بے روزگاری الاؤنس ملتا ہے۔ اِس طرح لاکھوں افراد ایسے ہیں جو گھر بیٹھے بے روزگاری الاؤنس وصول کرتے ہیں اور ملک میں بے روزگاری میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ بے شمار پاکستانی، بھارتی، سیاہ فام اور دوسرے ایشیاتی اور

جنوبی امریکہ کے ممالک سے آئے ہوئے افراد تو جان بوجھ کر کوئی کام نہیں کرتے، اور بے روزگاری الاؤنس اینٹھتے رہتے ہیں۔ اِن ملکوں کا بے روزگار بھی کاروں میں گھومتا ہے۔ ایئرکنڈیشنڈ گھروں میں رہتا ہے اور اچھا کھاتا پہنتا ہے۔ اِس لیے جب مَیں اپنے ملک کے بیوروکریٹس اور مالیاتی بازیگروں کی زبانی یہ دلیل سُنتا ہوں کہ بھاتی بیروزگاری تو یورپ اور امریکہ میں بھی خوب زوروں پر ہے تو بہت حیرت ہوتی ہے۔ یہ حضرات جانتے بوجھتے الفاظ اور اعداد و شمار کے ہیر پھیر کے ذریعہ عوام الناس کو بہلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی نااہلی اور عدمِ کارکردگی کو حق بجانب قرار دینے کے لیے بودی دلیلیں دیتے ہیں اور ان کا ضمیر انھیں ملامت نہیں کرتا۔

جہاں تک تنخواہوں اور معاوضوں میں اضافہ کا تعلق ہے۔ ان کو بھی بدقسمتی سے ہمارے ملک میں لفاظی اور اعداد و شمار کے مخملیں پردوں میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے اور سند کے طور پر مثال پیش کی جاتی ہے یورپ اور امریکہ کی، حالانکہ ہمارے ہاں معاوضوں میں اضافے برائے نام ہوتے ہیں جبکہ اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اضافے بے حد و شمار، مثلاً کینیڈا کے ڈیلڈرز کو فی ہفتہ سوا دو ہزار ڈالر کے لگ بھگ معاوضہ ملتا ہے اور وہ اب اس میں بھی اضافے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ بہت جان ماری اور جوکھوں کا کام ہے اور کوئی شخص چھ سات سال سے زیادہ اس کام میں مصروف نہیں رہ سکتا۔ اِس لیے زیادہ معاوضہ ملنا چاہیے۔ اسی طرح شمالی امریکہ میں کاروں کی صنعت سے وابستہ کارکنوں نے معاوضوں میں اضافے کا مطالبہ کیا تو کمپنیوں نے انھیں ایک ڈالر فی گھنٹہ اضافے کی پیش کش کی یعنی ۸ ڈالر روزانہ اور ۴۸ ڈالر فی ہفتہ اور قریباً دو سو ڈالر مہینہ۔ مگر مزدوروں نے یہ پیش کش ٹھکرا دی ہے ان دنوں مزدوروں کی یونینوں اور کمپنی کے حکام کے مابین مذاکرات ہو رہے ہیں۔ مقصد کہنے کا صرف یہ ہے کہ اگر مسائل کی پردہ پوشی کرنے کی بجائے ان کا مقابلہ کرنے

اور صدقِ دل سے انھیں حل کرنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں مگر کیا ہم اس اصول پر عمل پیرا ہیں ؟

اب ایک انکشاف سُنیے ۔ ریسرچ کرنے والے یہ خبر لاتے ہیں کہ امریکی خاتونِ اوّل مسز نینسی ریگن کے شاہانہ طور طریقوں کا سبب یہ ہے کہ وہ ملکہ ایلزبتھ اور ڈیانا کی رشتہ دار ہیں ۔ تقریباً ایک ہزار سال پہلے انگلستان کے بادشاہ سے نینسی کے اجداد کی رشتہ داری تھی ۔ کہیے کتنا قریبی رشتہ ہے ۔ ڈیانا سے نینسی کی رشتہ داری کا سلسلہ یہ ہے کہ ۱۶۳۰ء میں نینسی کے جو اجداد امریکہ آتے تھے وہ ڈیانا کے اجداد کے بھی رشتہ دار تھے ۔ مگر نینسی کو اس نئی قرابت پر ناز کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اِس لیے کہ ریسرچ کے مطابق اس وقت امریکہ کے لگ بھگ پانچ کروڑ باشندے انگلستان کے شاہی خاندان کے دُور کے رشتہ دار ہیں ۔ اِسی طرح امریکہ میں ڈیانا کے رشتہ داروں کی تعداد بھی دو سے تین کروڑ کے قریب ہے ۔

امریکی لکھ پتی

ہم سب جانتے ہیں کہ ایک محدود حلقے کی ظاہری خوشحالی سے قطع نظر پاکستان ایک غریب اور ترقی پذیر مُلک ہے ۔ ہمارے ملک میں اوسط آمدنی بے حد کم ہے ۔ زندگی کی آسائشیں تو ایک طرف بہت بڑی اکثریت کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی نصیب نہیں ہیں ۔ روزگار کے وسائل محدود ہیں ۔ تعلیمی سہولتیں برائے نام ہیں ۔ طبّی سہولتوں کا یہ عالم ہے کہ بڑے شہروں میں بھی عام لوگ اچھّے علاج سے محروم رہتے ہیں اور دیہات میں تو میلوں تک ڈاکٹر اور ہسپتال کا پتہ نہیں ملتا ۔ مختصر یہ کہ بحیثیت قوم ہم ایک غریب اور پسماندہ قوم ہیں ۔ دوسری طرف اگر معاشی حالت پر نظر ڈالیے تو وہ بھی تشویشناک حد تک پریشان کُن ہے ۔ ملک اربوں ڈالر کا مقروض ہے یہاں تک کہ بعض اوقات تو ہم بیرونی ملکوں سے لیے ہوئے قرض کا سود تک ادا نہیں کر سکتے اور ان سے رعایتیں طلب کرتے ہیں ۔ اِس کے باوجود ہم نئے قرضے حاصل کرنے کی جدّوجہد میں بھی لگے رہتے ہیں کیونکہ ہماری حکومتوں کے بقول ہمارے پاس پیسے کی کمی ہے اور ہم ایک غریب مُلک ہیں ۔ جب ہمارے سرکاری نمائندے کسی غیر ملکی حکومت سے مزید قرضہ حاصل کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسے ایک کارنامہ سمجھا جاتا ہے ۔ اخبارات، ٹی وی اور ریڈیو پر بڑے فخر کے ساتھ خوشخبری سُنائی جاتی ہے کہ فلاں ملک ہمیں مزید اتنی رقم

بطور قرض دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اِس بیوروکریٹ یا ڈپلومیٹ کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے جو کسی ملک سے قرضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کے مناصب و اعزاز میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ گویا ہم اپنی قومی اور ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھی دوسروں کے دست نگر ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ہماری حکومت یا قوم کو اس تلخ حقیقت کا مطلق احساس نہیں معلوم ہوتا۔

پہلے تو حکومت اور انتظامیہ کے رویّے کو دیکھ لیجیے، ہمارے اربابِ اختیار اور سیاسی لیڈر پچھلے چالیس سال سے قوم کو کفایت شعاری اور سادگی اختیار کرنے کی تلقین کر رہے ہیں لیکن بذاتِ خود سرکاری اخراجات جو پہلے ہی شاہانہ تھے اب "شہنشاہانہ" ہو گئے ہیں۔ جس فراخدلی بلکہ بیدردی سے حکّام اور سرکاری افسروں کے عیش و آرام پر روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے ملک میں اچانک تیل کے خزانے نکل آتے ہیں اور پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ حاکموں کی شان و شوکت اور آسائشیں دیکھ کر پُرانے بادشاہوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ عالیشان عمارتیں کروڑوں روپے کی لاگت سے تعمیر کی جا رہی ہیں۔ ان کی زیبائش پر بھی کروڑوں خرچ کیے جا رہے ہیں۔ معمولی سرکاری افسر بھی ہونڈا کار سے کم سواری استعمال کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ جس کی قیمت سوا تین لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ پھر ان کا رہن سہن دیکھیے تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ فضول خرچیوں کی انتہا ہو چکی ہے۔

اس پر طرّہ یہ کہ قومی سرمائے کا ضیاع بھی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ کروڑوں روپے کا نقصان تو اب قابلِ توجہ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ اب عام لوگ بھی ایک دو کروڑ کے نقصان کو اہمیت نہیں دیتے۔ ایک طرف حکمرانوں کا یہ رویّہ اور یہ طمطراق ہے کہ اسمبلیوں، وزارتوں اور حکومتی انصرام پر اربوں روپے خرچ کر رہے ہیں تو دوسری طرف جو لیڈر ایوانِ اقتدار سے باہر تشریف فرما ہیں ان کی (چند کو چھوڑ کر) شان و

شوکت بھی کم نہیں ہے۔ ان کی رہائش، ان کی دعوتیں، ان کی تقریبات بھی الف لیلائی محفلوں سے کم نہیں ہیں۔ جب ہمارے مُلک میں "جمہوریت" پر پابندی لگ گئی تو ہمارے لیڈروں نے ضیافتوں کی سیاست کو رواج دیا اور اب یہ معمول میں داخل ہو چکا ہے اِن دعوتوں کی تصویریں لوگوں کی نگاہیں چکاچوند کرنے کے لیے آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی سماجی تقریبات بھی چمک دمک میں کسی سے کم نہیں ہوتیں۔ ان کی آمدورفت ایئرکنڈیشنڈ کاروں اور ہوائی جہازوں کے بغیر ممکن نہیں سمجھی جاتی۔ ان کی زندگی بھی آسائشوں اور زیبائشوں سے محروم نہیں ہے۔ غرض یہ کہ حکومت سے لے کر آئندہ حکومت کرنے کے دعویداروں تک شاہ خرچیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔

ایک طرف آج کے سربراہ اور مستقبل کے حکمرانوں کا یہ طور ہے اور دوسری طرف عام زندگی اور معاشرے میں بعض لوگ جس تیزی سے دولت مند ہو رہے ہیں اور جس انداز سے دولت لُٹانے کی عادت میں مبتلا ہو رہے ہیں وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ عالیشان مکانوں، شاندار کاروں اور زندگی کی آسائشوں کا ایک سیلاب ہے جس نے معاشرے کے ایک محدود طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اخراجاتِ زندگی اور مہنگائی میں خواہ کتنا ہی اضافہ ہو جائے اس مخصوص طبقے کے لامحدود اخراجات اور فضول خرچیوں میں ذرّہ بھر کمی نہیں ہوتی۔ معیارِ زندگی اس قدر بلند کر لیا گیا ہے کہ ترقی یافتہ اور دولت مند ملکوں میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ظاہری شان و شوکت زندگی کا ایک حصّہ بن چکی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص ان آسائشوں کو کم سے کم مدّت میں حاصل کرنے اور ان سے فائدہ اُٹھانے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ اس بے دردی کے ساتھ دولت کے استعمال کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ معاشرے کے جس طبقے نے دولت حاصل کی ہے اس کے لیے اسے کسی طویل جدّوجہد اور محنت و کوشش کی ضرورت نہیں

پڑی۔ ہاتھ پیر ہلائے بغیر راتوں رات امیر ہو جانے کی مثالیں اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ اب ہر شخص فوراً امیر ہونے کی تگ و دو میں نظر آتا ہے۔ مشقت، محنت، طویل منصوبہ بندی اور صبر کا عنصر اب ناپید ہو چکا ہے۔ اِس لیے جائز و ناجائز کی تمیز بھی باقی نہیں رہی ہے۔ جس طبقے کو خوشحالی نصیب ہے۔ اس نے اس کے حصول کی خاطر زیادہ تگ و دو نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ وہ اس آسانی سے حاصل کی ہوئی دولت کو آنکھیں بند کر کے لٹانے میں ذرا بھی تامّل نہیں کرتا۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے کہ آسانی سے کمایا، آسانی سے گنوایا۔ اُردو میں بھی اس کے مترادف "مال حرام بود بجائے حرام رفت" عرصہ دراز سے استعمال میں ہے۔ جس طرح ان مٹھی بھر شہریوں کو آسانی سے دولت حاصل ہو گئی ہے اسی طرح حکمرانوں کو آسانی سے اقتدار مل گیا ہے۔ اِسی لیے دولت کے اسراف کے سلسلے میں دونوں کا رویّہ یکساں نظر آتا ہے۔

اِس کے برعکس اگر ترقّی یافتہ اور خوشحال ملکوں پر نظر ڈالیں تو بے تحاشا فضول خرچی (نہ سرکار کی اور نہ ہی عوام کی) ناپید ہے۔ سرکاری اخراجات بھی سوچ سمجھ کر کیے جاتے ہیں اور عوام بھی غور و فکر کے بعد پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں پارکوں کی تعمیر پر کروڑوں خرچ کر دیئے جاتے ہیں جبکہ امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کے بلدیاتی ادارے سڑکوں کی مرمّت اور دوسرے ضروری اخراجات کے لیے بڑی کوشش کے بعد حکومت سے رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کا یہ حال ہے کہ قیمتوں میں معمولی اضافہ بھی برداشت نہیں کر سکتے اور چند سینٹ بچانے کے لیے میلوں کا فاصلہ طے کرنے میں بالکل تامّل نہیں کرتے۔ اسراف کے سلسلے میں جو حکومتوں کا رویّہ ہے بالکل وہی طرزِ عمل معاشرے کا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ خوشحال ترین ملکوں میں شامل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق وہاں دس لاکھ سے زیادہ لکھ پتی ہیں۔ یعنی ہر سو خاندانوں میں سے ایک خاندان

لکھ پتی ہے۔ یہ لکھ پتی ساری قومی آبادی کا ایک فی صد حصّہ ہیں لیکن نجی سرمائے کا ۳۲ فیصد ان کے پاس ہے۔ لیکن یہ لوگ لکھ پتی بنے کس طرح؟ ایک حالیہ سروے کے مطابق عام طور پر ایک امریکی ساٹھ سال کی عمر میں لکھ پتی بنتا ہے۔ ۳۰ سال تک وہ سخت محنت اور جدّ و جُہد کرتا ہے۔ ہفتے میں ۶ دن اور دن میں بارہ گھنٹے کام کرتا ہے تب کہیں جا کر لکھ پتیوں کی صف میں شامل ہو سکتا ہے اس کے مقابلے میں ہمارے ملک میں دولت مند ہونے والوں پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

امریکی لکھ پتیوں کی بیگمات محض خرچ کرنے اور فیشن اختیار کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں بلکہ عموماً کام میں اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ امریکی لکھ پتی شاندار محلوں میں نہیں رہتے۔ عام قسم کے گھروں میں معمول کے مطابق کسی ٹھاٹ باٹ کے بغیر زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے پڑوسیوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ لکھ پتی ہیں۔ وہ شاندار قیمتی کاروں کی جگہ عام کاریں استعمال کرتے ہیں اور اس طرح روپیہ مزید کاروبار میں لگا کر اپنے بزنس کو فروغ دیتے رہتے ہیں۔

ہمارے ہاں دولت مندی اور خوشحالی کا لازمی نتیجہ عموماً نئی شادی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے جبکہ امریکی لکھ پتیوں کی ۹۹ فیصد تعداد پُرانی بیوی کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ یہ لکھ پتی بہت سوچ بچار کے بعد روپیہ خرچ کرتے ہیں، ان کے گھروں کی زیبائش اور خوراک وغیرہ عام لوگوں کی طرح ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ مزید محنت اور کاوش کے ذریعے اپنے کاروبار اور دولت میں اضافہ کرے نہ کہ اپنی دولت پر عیش کرے اور اس کی جا و بے جا نمائش کرے۔ امریکہ میں جس طرح لکھ پتی بننا آسان نہیں ہے اسی طرح بدستور لکھ پتی رہنا بھی بہت مشکل ہے۔ اپنے کاروبار کو سنبھالنے اور پھیلانے کے لیے ہر شخص کو مسلسل محنت اور جدّ و جہد کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فضول خرچی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ان

کی گھریلو زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ ان کے بچے عام اسکولوں میں پڑھتے ہیں، ان کی بیویاں کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

دس لاکھ ڈالر کے مالک کو لکھ پتی کہا جاسکتا ہے لیکن عام طور پر وہاں پچاس ساٹھ لاکھ ڈالر والے بھی خود کو "امیر" نہیں سمجھتے اور نہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے گھر کا سالانہ خرچہ پچاس ساٹھ ہزار ڈالر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ سروے کے مطابق وہ ایک متوسّط طبقے کے شخص کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

اب آپ پاکستانی لکھ پتی اور امریکی لکھ پتی کے فرق کا بذاتِ خود اندازہ لگا لیں اور یہ بھی دیکھیں کہ لکھ پتی تو ایک طرف ہمارے ملک میں تو اب متوسّط طبقہ بھی درمیانی طبقے کی طرح زندگی بسر کرنے کا قائل نہیں رہا۔ یوں سمجھئے کہ امریکی اور پاکستانی معاشرے کے درمیان جو فرق ہے یہی فرق امریکی اور پاکستانی معیشت اور حکومتوں میں بھی ہے۔

اب ذرا ایک بار پھر اس انگریزی محاورے کو یاد کیجئے۔ "آسانی سے آیا۔ آسانی سے گیا۔" کہئے کچھ سمجھ میں آیا؟

سگ پرستی

مغرب کی معاشرت میں جانوروں اور خاص طور پر کُتّوں بلیوں کو جو بلند مقام حاصل ہے اِس کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ہم کینیڈا پہنچے تو خبر شائع ہوئی کہ ایک کروڑ پتی خاتون اپنا سب کچھ اپنی اکلوتی بلّی کو سونپ گئی ہیں، کتّوں اور بلّیوں کے بارے میں ایسی خبریں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جب تک ہم نے یورپ اور امریکہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو ہمیں بھی ان داستانوں پر بہت حیرت ہوا کرتی تھی۔ مگر جب بذاتِ خود دیکھا تو ان کی صداقت پر بھی یقین آگیا اور اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ مغرب کی سوسائٹی نے خاندان اور رشتوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ صنعتی نظام نے انسان کو مشین بنا دیا ہے۔ افراتفری اور سماجی نفسانفسی کا عالم ہے، مادہ پرستی نے لوگوں کو انسانی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا ہے ایک خاص عمر کے بعد نہ اولاد کا ماں باپ سے واسطہ رہتا ہے اور نہ ماں باپ اور بہن بھائی کا (کرسمس اور سالگرہ کارڈ کے سوا) ایک دوسرے سے کوئی تعلّق رہتا ہے۔ بہت ہُوا تو ٹیلی فون پر بات کر لی۔ بس لے دے کر رشتہ داریاں اِس حد تک رہ گئی ہیں۔ شوہر اور بیوی کا رشتہ تو خیر ہے ہی بہت کمزور۔ مغرب والوں نے اِسے کچّے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور کر دیا ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر میاں بیوی

میں علیحدگی ہو جاتی ہے اور اب گزشتہ چند سالوں سے تو شادی نہ کرنے اور شادی کے بغیر عارضی طور پر مرد اور عورت کے یکجا رہنے کا رواج پروان چڑھ چکا ہے۔ اور اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ نہ شادی کے بغیر بچّوں کی پیدائش اخلاقی، سماجی یا قانونی اعتبار سے جُرم یا گناہ سمجھی جاتی ہے۔ اسقاطِ حمل کو بے شمار ملکوں میں قانونی مدد حاصل ہو چکی ہے غرضیکہ رشتے ناتوں اور برادری، ذات پات۔ خاندان اور یکجا ساتھ رہنے کا دستور دم توڑ چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں کا انسانوں سے تعلّق اور ہمراہی برائے نام رہ گئی ہے۔ تنہائی کا سب سے بڑا رفیق لے دے کر جانور رہ گیا ہے۔ کُتّا اور بلّی دو ایسے جانور ہیں جو انسانوں میں پالتو جانوروں کی حیثیت سے سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ کُتّا مفید اور کارآمد جانور بھی ہے۔ ذہین اور وفادار بھی ہے۔ مغرب کی سوسائٹی میں بے شمار مرد، عورتیں خصوصاً بوڑھے کُتّوں کی رفاقت اور ہمراہی کے محتاج ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے شہروں میں بوڑھی عورتوں اور مردوں کو شدید موسموں میں گھر سے باہر جانے اور سودا سلف لانے کے لیے کُتّوں ہی کی امداد حاصل ہوتی ہے۔ بازاروں اور گلیوں میں آپ کو بے شمار بوڑھے اور بوڑھیاں کُتّوں کے ساتھ سردی میں ٹھٹھرتے یکّہ و تنہا آتے جاتے نظر آئیں گے۔ اگر کُتّا بھی ان کے ساتھ نہ ہو تو اکیلے گھروں میں وہ پاگل ہو جائیں، یا دیواروں سے سر پھوڑ کر مر جائیں۔ بلّی اتنی کارآمد اور وفادار نہیں سمجھی جاتی۔ مگر رفاقت کے لیے کافی ہے اس کے کاموں میں مصروف ہو کر بوڑھے اپنی تنہائی کو بھول جاتے ہیں۔ اِن جانوروں سے باتیں کرتے ہیں۔ گھروں کی اُداس تنہائیوں میں یہ جانور انھیں محبت کی گرمی فراہم کرتے ہیں۔ جب پیار سے ان کے پاس آکر بیٹھتے ہیں یا محبّت بھری نظروں سے انھیں دیکھتے ہیں تو وہ اپنی اولاد کی غیر موجودگی کو فراموش کر دیتے ہیں۔ سرد راتوں میں کوئی ذی نفس تو ہے جو ان کے ساتھ موجود ہے ان کو بستروں میں پاکر انھیں اپنے جُدا ہونے والے بچّوں کی کمی کا احساس نہیں رہتا۔

گویا اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو کُتّا اور بلّی اہلِ مغرب کی ایک ناگزیر ضرورت اور ترقّی یافتہ سوسائٹی کی بہت بڑی مجبوری بن کر رہ گئے ہیں۔ ویسے بھی یہ تو میں جانوروں خصوصاً کُتّوں کو بہت زیادہ چاہتی ہیں۔ بچّہ ہوش سنبھالنے کے بعد بہن بھائی کی بجائے کُتّے بلّی کو اپنا رفیق اور ساتھی پاتا ہے۔ ذرا بڑا ہوتا ہے تو ماں باپ سے زیادہ کُتّے بلّی کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ اِس طرح یہ رشتہ بچپن ہی سے مضبوط ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بڑھاپے کی عمر میں پہنچ کر تو ان لوگوں کو کتّوں اور بلّیوں کے سوا کوئی پوچھنے والا، محبت سے مخاطب کرنے والا نظر تک نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوم سگ نواز اور سگ پرست کہلاتی ہے۔ بلّیاں اور دوسرے جانور بھی پالے جاتے ہیں مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اپنی افادیت کی وجہ سے کُتّے بہت زیادہ مقبول ہیں۔ لہٰذا اگر کُتّے اور بلّی کے اِن احسانوں کا بدلہ اُتارنے کے لیے یہ لوگ ان کی خدمت کرتے ہیں، ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد ان کو اپنی پونجی سونپ جاتے ہیں تو اس میں تعجّب کی کوئی بات نہیں ہے۔

کُتّوں اور بلّیوں کی پرورش اور دیکھ بھال ترقّی پذیر ملکوں کے بدنصیب باشندوں سے بھی زیادہ اہتمام سے کی جاتی ہے۔ ان کے علاج کے لیے بہترین ہسپتال اور ڈاکٹر موجود ہیں۔ بلکہ اب تو جانوروں کے نفسیاتی علاج کے لیے ماہرِ نفسیات بھی وجود میں آگئے ہیں۔ ان کی صحت اور پرورش پر بہت زیادہ توجّہ دی جاتی ہے، ان کی خوراک کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ شمالی امریکہ میں کُتّوں اور بلّیوں کی خوراک کے لیے جو اہتمام کیا جاتا ہے اور اس پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے وہ بیشتر ملکوں کے سالانہ بجٹ سے کہیں زیادہ ہے۔ کروڑوں اربوں ڈالر کی لاگت سے کُتّوں اور بلّیوں کی خوراک تیار کرنے والے ادارے قائم کیے گئے ہیں جن کی سالانہ بکری بھی اربوں ڈالر میں ہوتی ہے۔ اس کی خوبی کا اندازہ یوں لگائیے کہ ان میں غذائیت، وٹامنز، معدنیات

اور ہارمونز کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے۔ نہایت نفیس اور صاف ستھرے سربند ڈبوں میں انھیں پیک کیا جاتا ہے۔ جانوروں کی خوراک کے ڈبے دیکھ کر انسانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ صورت شکل ایسی کہ جب خوبصورت پلیٹوں میں یہ خوراک نکال کر جانوروں کے سامنے رکھی جاتی ہے تو جانور تو جانور انسان تک کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ درجنوں قسم کے کُتّوں اور بلّیوں کے کھانے بازار میں دستیاب ہیں اور جو خوراک یہاں کے کُتّے اور بلّیاں کھاتے ہیں ایشیائی اور افریقی ممالک کے بہت سے متوسط طبقے کے لوگوں کو بھی ایسی غذا میسّر نہیں ہے اور پھر اس خوراک کی پبلسٹی نہایت زور شور سے کی جاتی ہے۔ ٹیلی ویژن کی پبلسٹی شمالی امریکہ میں ایک انتہائی گراں چیز ہے۔ مگر صبح سے رات گئے تک کُتّوں اور بلّیوں کی خوراک کے نت نئے اور حسین ترین اشتہار ٹی وی پہ پیش کیے جاتے ہیں اور اتنے دلکش انداز میں پیش کیے جاتے ہیں کہ ان جانوروں کی قسمت پر رشک آتا ہے۔ ہمارے ملک میں تمباکو والے اشتہار بازی پر روپیہ خرچ کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ مگر امریکہ اور کینیڈا میں کُتّوں اور بلّیوں کی خوراک کے اشتہاروں پر جو رقم صرف کی جاتی ہے وہ پاکستان ٹی وی کے کل بجٹ سے کئی گُنا زیادہ ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہاں کے جانور ہمارے انسانوں کی اکثریت کے مقابلے میں کتنے زیادہ خوش نصیب ہیں۔

کُتّوں بلّیوں کے ڈاکٹر اور ہسپتال تو خیر موجود ہی تھے مگر اب ان کے نفسیاتی مسائل حل کرنے کے لیے جانوروں کے ماہرین نفسیات کا ایک طبقہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ جانوروں کی نفسیات کے بارے میں سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر سب سے بڑھ کر مزے کی بات یہ ہے کہ جس طرح اپنے پاکستانی اخبارات میں مردوں، عورتوں طلبہ وغیرہ کے مسائل شائع ہوتے ہیں اسی طرح یہاں کے ممتاز روزناموں میں اب جانوروں کے مسائل کے بارے میں بھی مستقل اور باقاعدہ کالم شائع ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے اخباروں

میں رُوحانی مسائل، قانونی مسائل، نفسیاتی مسائل، صحت کے مسائل کے بارے میں سوالوں کے جوابات شائع ہوتے ہیں تو یہاں کے اخباروں میں کُتّوں، بلّیوں کے مسائل کے بارے میں سوالات شائع ہوتے ہیں جن کے جوابات ماہرین نفسیات دیا کرتے ہیں کوئی اور کہتا تو شاید ہم مذاق سمجھتے یا مبالغے پر محمول کرتے لیکن جب ٹورانٹو کے ممتاز ترین روزنامہ "ٹورانٹو اسٹار" میں ہم نے بذاتِ خود جانوروں کے مسائل کے کالم پڑھے تو یقین آ گیا کہ واقعی یہاں کے جانور اب کتنے زیادہ ترقی یافتہ ہو چکے ہیں یعنی اس حد تک کہ کُتّے، بلّی، لومڑی، گلہری وغیرہ بھی نفسیاتی مشکلات میں مبتلا ہیں اور کیوں نہ ہوں، ترقی یافتہ ملکوں کے جانور بھی کسی معاملے میں انسانوں سے پیچھے کیوں رہیں؟

نمونے کے طور پر جانوروں سے تعلق رکھنے والے کچھ مسائل اور ان کے حل ملاحظہ فرمایئے :-

ایک صاحب کی ایک سالہ کُتیا کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ جب اسے زیادہ لاڈ کیا جائے یا لوگ اس پر زیادہ توجہ دیں تو وہ مارے خوشی کے پیشاب کر دیتی ہے۔ ان صاحب نے جانوروں کے ڈاکٹر سے مشورہ لیا اس نے ہارمونز کی گولیاں تجویز کیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ سزا کے طور پر کُتّے کو گھر سے باہر بھی رکھا گیا مگر بے سود۔ بتایئے اس کا کیا علاج کیا جائے؟ جواب میں ماہر نفسیات ڈاکٹر مثل ملٹس نے مشورہ دیا ہے کہ آپ اپنے دوستوں اور مہمانوں کے سامنے اس کی تعریف نہ کیا کریں۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ عادت دُور ہو جائے گی۔

ایک صاحبہ لکھتی ہیں کہ ہمارا دو سالہ کُتّا جو میں نے حال ہی میں گود لیا ہے میری دو بلّیوں کا دشمن ہے۔ اگر ہم میاں بیوی سامنے نہ ہوں تو شاید وہ بلّیوں کو جان سے مار دے۔ مشکل یہ ہے کہ بے چاری بلّیوں کے ناخن نکلوا دیتے گئے ہیں اور وہ جوابی کارروائی مدافعت سے بھی مجبور ہیں۔ ہم ان تینوں سے پیار کرتے ہیں بتایئے کیا کریں؟

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ہے کہ جب تک آپ کے کُتّے کے دل میں خدانخواستہ نہ ڈالے آپ اسے بلّیوں سے الگ رکھیں۔ بعض کُتّے بلّیوں کو پسند کرتے ہیں۔ بعض انھیں برداشت کر لیتے ہیں مگر بعض ان کے دشمن ہوتے ہیں یہ ان کی طبعی اور خاندانی کمزوری ہوتی ہے جس پر قابو پانا مشکل ہے۔ اِس لیے صبر کریں۔ یا ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔

ایک اور صاحب کو شکایت ہے کہ ان کی بلّی سارے سال چھینکیں مارتی رہتی ہے ڈاکٹروں کو دکھایا، وہ کہتے ہیں کہ کسی قسم کی جراثیمی بیماری نہیں ہے ورنہ اب تک وہ اللہ کو پیاری ہو جاتی اس طرح ایک تو کپڑے خراب ہوتے ہیں دوسرے گھر میں جراثیم پھیلتے ہیں۔ بتلایئے کیا کروں؟ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ کسی قسم کی الرجی معلوم ہوتی ہے کسی ماہر کو دکھائیں خون کا ٹیسٹ اور ایکسرے کرائیں۔ ناک اور سینے کا ایکسرے ضروری ہے۔ اِس کے بعد پتہ چلے گا کہ کیا ہو؟

چند اور نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

سوال :۔ میری بارہ سالہ بلّی جب کبھی آئینہ دیکھتی ہے خوف زدہ ہو جاتی ہے جبکہ وہ کسی دوسری بلّی کو دیکھ کر ایسا نہیں کرتی۔ کیا وجہ ہے؟

جواب :۔ معلوم ہوتا ہے وہ آئینے میں عکس کو بھوت سمجھتی ہے شاید اس کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی اور بلّی شیشے کے اندر بند نہیں ہو سکتی۔ ماہر نفسیات کو دکھائیں

سوال :۔ ہمارا گیارہ سالہ کُتّا موٹاپے کا شکار ہو گیا ہے اسے گنٹھیا ہے اِس لیے زیادہ ٹہلانا بھی مشکل ہے۔ مَیں نے اسے ڈائٹنگ بھی کرائی اور اُبلے ہوتے چاول آدھے اُبلے ہوتے انڈے اور ترکاریاں کھلانا شروع کر دیں مگر اس کا وزن چالیس پونڈ سے کم نہیں ہوتا۔ کیا کروں؟

جواب :۔ اس کی خوراک ۲۵ فیصد کم کر دیں۔ خوراک میں پروٹین کم کر دیں۔ اور

کوجو خوراک دیتے ہیں اس کی کمپنی بدل دیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ شاید اِس سے زیادہ لاڈ کرتے ہیں۔ اپنی توجہ کم کر دیں اور اسے کولڈ شولڈر دیں۔ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

سوال :۔ ہمارا کُتّا سولہ سال کا ہو گیا ہے ہر طرح ٹھیک ہے مگر اس کی شخصیت میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ جس سے ہم فکر مند ہیں اکثر وہ موڈی ہو جاتا ہے۔ چھونا پسند نہیں کرتا۔ ہاتھ لگائیں تو غرّاتا ہے۔ دانت دکھاتا ہے۔ بہت پریشانی ہے۔

جواب :۔ اگر وہ کبھی کبھی ایسا کرتا ہے تو اسے نظر انداز کر دیں۔ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ نہ بھولیں کہ وہ ضعیف ہو چکا ہے انسانی عمر کے مطابق اس کی عمر اب ۹۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ اِتنے بوڑھے کُتّے سے خوش مزاجی کی امید فضول ہے شکر کریں کہ وہ زیادہ تر بدمزاجی نہیں کرتا۔ محض کبھی کبھی کرتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کریں۔

سوال :۔ اپنے ایک سالہ کُتّے کو ہم نے مخصوص جگہ پر حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کی عادت ڈالی تھی مگر اب وہ کمرے میں ہر جگہ گندگی پھیلاتا ہے، منع کرو تو غرّاتا ہے۔ ڈانٹو تو افسردہ ہو جاتا ہے اور چُپ چاپ گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ اس کا ڈاکٹر کہتا ہے کہ کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہے نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ عادت کیسے چھڑاؤں؟

جواب :۔ آپ اس کا نفسیاتی تجزیہ کرائیں۔

سوال :۔ میری بلّی کو اپنے بال چاٹنے کی عادت ہے مگر اب وہ اپنی دُم بھی چبانے لگی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے پیٹ کے بال بھی نوچ نوچ کر کھاتی ہے مَیں بہت فکر مند ہوں۔ اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔

جواب :۔ اکثر بلّیاں اپنے بال چاٹتی ہیں مگر دُم چبانا کسی ذہنی الجھن کی علامت ہے کئی بار بلّیاں بوریت کی وجہ سے بھی ایسا کرتی ہیں۔ اس کا دل بہلانے کا سامان کریں۔

سوال : میرا تین سالہ ڈوبرمین کتا شاید تنہائی کا شکار ہو گیا ہے۔ میں سارا دن گھر سے باہر رہتی ہوں۔ وہ صوفے نوچتا ہے۔ دروازے چباتا ہے۔ یوں تو وہ بہت تمیز دار ہے مگر شاید تنہائی محسوس کرنے لگا ہے کیا خیال ہے ؟ اس کے لیے کوئی رفیقِ حیات تلاش کروں ؟

جواب : یقیناً مگر اچھی نسل کی ہو بلکہ اسی کی نسل سے تعلق رکھتی ہو، یہ بھی خیال رکھیں کہ اس کے ماں باپ آپ کے کتے کو پیار کرتے ہوں۔ ورنہ مستقبل میں پرابلم پیدا ہو جائے گا۔ ان کو زیادہ میل جول کا موقع بھی نہ دیں ورنہ آپ کا گھر پلوں سے بھر جائے گا۔ اس نسل کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کرنا ہو گی اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

سوال : میرا دو سالہ کتا بیمار ہو گیا ہے۔ اس کی اجابت میں سفید کیڑے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے گولیاں دی تھیں مگر فائدہ نہیں ہوا۔

جواب : فوراً اجابت ٹیسٹ کرائیں اور پتہ کریں کہ کس قسم کے کیڑے ہیں۔ اس کو خوراک راس نہیں ہے اس کی خوراک تبدیل کریں۔ اسے وٹامن دیں۔ پھل کھاتے تو کھلائیں دودھ پلائیں۔

سوال : ہمارے چار سالہ اور دو سالہ کتوں نے ساری زندگی مرغی کے گوشت کے سوا کچھ نہیں کھایا۔ اب ہم نے بہترین قسم کی ڈبوں کی خوراک بھی کھلائی مگر وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ہم ان کی یہ عادت کیسے چھڑوائیں ؟

جواب : یہ مسئلہ بہت زیادہ نازک ہے، مرغی کے گوشت میں فاسفورس زیادہ اور کیلشیم کم ہوتا ہے وٹامنز اور معدنیات بھی تناسب سے نہیں ہوتے۔ یہ آگے چل کتوں کی صحت کے لیے بُرا ہے۔ آپ مرغی کے گوشت کو دوسرے گوشت کے کھانوں میں ملا کر دیں۔ اس طرح کہ انھیں خبر نہ ہو، پھر یہ مقدار بڑھا دیں۔ یہاں تک کہ مرغ بالکل کم کر دیں۔ اگر وہ یہ ملی جلی خوراک نہ کھائیں تو اور کچھ نہ دیں۔ ایک دو دن

بھوکے رہیں گے تو خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔

سوال : میری بلی اپنی مقررہ جگہ کی بجائے میرے قالین پر پیشاب کرنے لگی ہے۔ میں نے ایک بار دیکھ لیا تو سزا کے طور پر اس کی ناک کو مسلا۔ مگر اب وہ تاک میں رہتی ہے۔ میری نظر بچا کر پیشاب کر دیتی ہے۔ قالین کی پروا نہیں ہے۔ بلی کی عادت خراب ہو رہی ہے۔

جواب : یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ آپ اس کے پیشاب کے برتن کو اپنے قالین پر رکھنا شروع کر دیں۔ اس کو نفسیاتی تسکین ملے گی۔ اس کے بعد ہر رات برتن کو تھوڑا سا قالین سے دُور کر دیں۔ یہاں تک کہ مقررہ جگہ تک پہنچ جائے۔ اس کو محسوس بھی نہ ہو گا اور آپ اس کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ اگر پھر بھی ٹھیک نہ ہو تو اس کا پیشاب کا برتن تبدیل کر دیں، ہو سکتا ہے وہ پرانا ہو گیا ہو اور بلی اس سے تنگ آ چکی ہو۔ دوسری بات یہ کہ برتن کی صفائی کا خاص اہتمام کریں اس میں بدبو نہ رہے اس لیے خوشبو وغیرہ استعمال کی جا سکتی ہے۔

سوال : میری سات ماہ کی بلی جب بھی تہہ خانے میں جاتی ہے میاؤں میاؤں کرتی ہے۔ بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ آخر وہ ایسا کیوں کرتی ہے ؟

جواب : میں نے بہت غور کیا مگر سمجھ میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے وہ تہہ خانے میں جا کر آپ کو پاس بُلانے کے لیے میاؤں میاؤں کرتی ہو۔ یا تہہ خانے میں اسے جذباتی خوشی محسوس ہوتی ہو۔

ایک صاحب نے شکایت کی ہے کہ میرا دو سالہ کتا میری منگیتر کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ جب بھی وہ آتی ہے۔ ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ غُراتا ہے۔ اس کو دیکھ دیکھ کر غصے سے منہ بناتا رہتا ہے۔ حالاں کہ دوسری لڑکیوں اور عورتوں کو وہ ناپسند نہیں کرتا۔ میں اپنی منگیتر سے بھی بہت زیادہ محبت کرتا ہوں اور کتے کو بھی عزیز

رکھتا ہوں۔ آئندہ زندگی میں بھی ان کا تعلق بہت اچھا ہونا چاہیے مگر کشیدگی موجود رہتی ہے۔ بتایئے کیا کروں۔ ماہر نفسیات نے مشورہ دیا ہے کہ آپ کے کُتّے اور آپ کی منگیتر کے طبعی رجحانات آپس میں نہیں ملتے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کو پسند نہیں کریں گے چنانچہ آپ فیصلہ کرلیں کہ کُتّے اور منگیتر میں سے کس کو چھوڑنا ہے۔

یقین ہے کہ ان صاحب نے منگیتر کو چھوڑ دیا ہوگا۔

رشوت!

امریکہ میں رشوت "شجرِ ممنوع" نہیں ہے۔ چھوٹے بڑے ہر پیمانے پر رشوت لی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو پکڑے جاتے ہیں۔ سزا ان ہی کو ملتی ہے۔ پچھلے دنوں ایک جج صاحب کو رشوت لینے کے الزام میں سزا دی گئی۔ وہ ایک سیاہ فام جج تھے۔ اب انھیں بیس ہزار ڈالر جرمانے اور تین سال قید کی سزا دی گئی ہے۔ ایک سابق سیکرٹری کو بھی رشوت کے جُرم میں سزا دی گئی ہے۔

حال ہی میں "امیگریشن" کے بارے میں بھی کئی سکینڈل اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلے ایک ایرانی وکیل جاوید کے بارے میں یہ مشہور ہوا کہ ان حضرت نے ہزاروں افراد کی رہائشی حقوق دلاتے اور امیگریشن کے عملے کی ملی بھگت سے ناجائز فیصلے کراتے اب ایک اور سابق امیگریشن انسپکٹر مسٹر "جے۔ بیب شی ہی" پر تقریباً بیس ہزار ڈالر رشوت لینے کے الزام میں مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ جنھوں نے سینکڑوں ہزاروں ایرانیوں کو جعلی کاغذات کی مدد سے امریکہ میں رہنے کے حقوق دلاتے۔ اس سازش میں اور بھی بہت سے لوگ شریک تھے۔

دراصل "امیگریشن" کا محکمہ یہاں خاصا سُست رفتار مشہور ہے اور بدنام بھی ہے، پہلے تو کسی کے کانوں پر جُوں نہیں رینگتی تھی مگر اب جبکہ دہشت نام۔ کوریا۔ افغانستان

کیوبا اور دوسرے ممالک سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ امریکہ کا رُخ کرنے لگے ہیں تو امریکیوں کو بھی "غیر ملکیوں" کی آمد کھلنے لگی ہے۔ اخبارات میں اِس موضوع پر آئے دن مضامین اور ایڈیٹوریل شائع ہو رہے ہیں اور اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ بے شمار غیر ملکیوں کی آمد کو روکنے کی غرض سے موجودہ قوانین میں تبدیلی کی جائے ورنہ امریکہ میں بھی وہی صورت حال پیدا ہو جائے گی جس سے انگلستان دوچار ہو چکا ہے۔ لہٰذا امریکی حکومت ملک میں غیر ملکیوں کے داخلے کو روکنے کے سلسلے میں ضروری تدابیر اختیار کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہے۔ اِس ضمن میں امیگریشن کا محکمہ بھی سب کی نظروں میں آگیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ "امیگریشن" کے محکمے میں "بہت گھپلا" ہے۔ چند غیر ملکی اور زیادہ تر امریکی وکیلوں نے لوگوں کو جائز اور ناجائز طریقوں سے امیگریشن کے حقوق دلانا ایک منفعت بخش پیشہ بنا رکھا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو یہ خاصا بڑا اسکینڈل ہے جس میں وکیلوں کا ایک طبقہ لاکھوں ڈالر کما رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ محکمے سے "ملی بھگت" کے بغیر تو یہ سب کام نہیں ہو سکتے۔ بہرحال محکمہ امیگریشن کے بارے میں یہ مقدمہ آج کل موضوع بحث بنا ہوا ہے اور خیال ہے کہ حکومت اس سلسلے میں مؤثر اور ضروری اقدامات کرے گی۔

۶۳ سالہ ایسی ڈور زیرمین کو ریاست امریکہ کی قانون ساز اسمبلی نے یہ حق دے دیا ہے کہ وہ نیویارک سٹیٹ کی انتظامیہ کے خلاف ہرجانے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ زیرمین کی کہانی کسی فلمی کہانی سے کم دلچسپ نہیں ہے جو اس طرح ہے۔

۱۹۳۸ء میں جب زیرمین ایک بھرپور نوجوان تھا۔ نیویارک پولیس نے قتل کے الزام میں اس کو گرفتار کر لیا اس پر مقدمہ چلایا گیا اور سرکاری سراغرساں نے اس کے خلاف تمام ثبوت پیش کر کے اسے سزائے موت دلا دی۔ جس دن زیرمین کو موت کی سزا دی جانے والی تھی۔ عین دو گھنٹے پیشتر گورنر نے اس کی سزائے موت معاف کر کے سزائے

عمر قید میں بدل دی۔ زیرمین کو اس سے دو ہفتے پہلے سے سزائے موت پانے والے مجرموں کے ساتھ رکھا گیا تھا اور اس کمرے کے آٹھ افراد کو یکے بعد دیگرے الیکٹرک چیمبر کی طرف لے جایا گیا تھا۔ اب زیرمین کی باری تھی۔ اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بہت شور مچایا مگر کسی نے اس کی آواز پر کان نہ دھرا جب وہ موت کو گلے لگانے کے لیے تیّار تھا تو اس کی سزائے موت کو عمر قید کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا۔ زیرمین بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے کہا کہ مَیں مرنا چاہتا ہوں۔ بے گناہی کے جُرم میں ساری عمر قید میں گزارنے سے بہتر ہے کہ مجھے پھانسی دے دی جائے۔ مگر کسی نے اس کی ایک نہ سُنی اور اس کی سزائے موت عمر قید کی سزا میں تبدیل ہو گئی۔ جب اس نے بہت شور مچایا تو اس پر سختیاں کی گئیں اسے زدوکوب کیا گیا۔ مہینوں اسے قید تنہائی میں رکھا گیا۔ عمر کے دس سال اس نے جیل میں اپنے محافظوں سے لڑتے جھگڑتے اور سزائیں پاتے ہوئے گزار دیتے۔ دس سال کے بعد اس کے طرزِ عمل میں تبدیلی ہوئی اور اس نے جیل رہ کر قانون کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ کچھ عرصے بعد ایک مثالی قیدی تھا۔ ۱۹۶۲ء میں اسے جیل سے رہا کر دیا گیا۔ مگر زیرمین نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ (۲۴ سال اور دس ماہ) جیل کی نذر کر دیتے اس نے چھوٹی موٹی ملازمتیں کر کے اپنا پیٹ پالنا شروع کر دیا۔ ان دنوں وہ ایک ہوٹل میں ڈورمین کے طور پر دو سو دس ڈالر فی ہفتہ کے معاوضے پر کام کر رہا ہے۔

حکومت نے زیرمین کو جیل سے رہا کرتے ہوتے یہ اقرار کیا کہ اسے غلط شہادتوں کی بنا پر سزا دی گئی تھی جو ناواجب تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ بے گناہ تھا۔

زیرمین نے نیویارک اسٹیٹ کے خلاف ہرجانے کا دعویٰ کرنے کی اجازت چاہی اور کئی دن کے غور و خوض کے بعد نیویارک اسٹیٹ کی مجلس قانون ساز نے اسے یہ حق دے دیا ہے کہ وہ حکومت کے خلاف دعویٰ کر سکتا ہے۔

زیمرمین حکومت کے خلاف ایک کروڑ ڈالر ہرجانے کا دعویٰ کر رہا ہے اُس کی داستان کا ان دنوں گھر گھر چرچا ہے اور مختلف اخبارات اس کی داستان شائع کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ زیمرمین کے وکیل نے بتایا ہے کہ کئی فلم سازوں سے بھی بات چیت چل رہی ہے۔ جو زیمرمین کی داستان کو فلمانا چاہتے ہیں اور اس کے عوض اسے بھاری معاوضہ اُدا کرنے کو تیار ہیں۔

خیال ہے کہ زیمرمین کو حکومت سے بھی ہرجانہ مل جائے گا۔ کتابوں، اخباروں اور فلموں سے بھی وہ لاکھوں کروڑوں ڈالر کمالے گا۔ مگر زیمرمین کا کہنا ہے کہ اس کی زندگی کے گزرے ہوتے سال اسے کون لٹائے گا؟ جیل میں اس نے جو مظالم سہے ہیں ان کا مداوا کون کرے گا؟

جنسی مسائل

مغربی ممالک میں اور خصوصاً امریکہ میں جنسی معاملات میں جس قدر آزادیاں لوگوں کو حاصل ہیں ان کے پیش نظر اگر اس قوم کو "مادر پدر آزاد" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لغوی معنوں میں بھی یہ درست ہے اِس لیے کہ نوجوانوں کو باپ کی طرف سے کسی قسم کی پابندی کا خوف نہیں ہے۔ بیان اور اظہار کی آزادی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور اسی طرح جنسی آزادی بھی عروج پر ہے۔ لیکن پھر بھی بعض عناصر کا یہ خیال ہے کہ ابھی "آزادی کی حد" بہت دُور ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں گاہے بگاہے مختلف قسم کی تحریکیں چلتی رہتی ہیں اور نت نئے قوانین وضع کیے جاتے ہیں۔ اِس سلسلے میں امریکہ کی مختلف ریاستوں میں مختلف قوانین نافذ ہیں۔ ریاست ورجینیا میں اسکولوں کے بچّوں کو جنسی تعلیم دینے کا قانون موجود ہے۔ مگر ریاست کی بعض (COUNTIES) میں یہ قانون نافذ نہیں ہے۔ گزشتہ ماہ فیئر فیکس کاؤنٹی نے اسکولوں میں بچّوں کو جنسی تعلیم دینے کا قانون نافذ کرنا چاہا تو بہت لے دے ہوئی۔ مخالفین نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور کہا کہ سکولوں میں بارہ تیرہ سال کی عمر کی بِن بیاہی مائیں اور ہر سال بے شمار اسقاطِ حمل ایسی تعلیم کا شاخسانہ ہیں۔ دھواں دھار تقریروں کے بعد جب رائے شماری ہوئی تو اکثریت اس تجویز کے حق میں تھی کہ بچّوں کو "بہتر شہری" بنانے کے لیے ضروری ہے کہ

انھیں اسکولوں میں جنسی تعلیم حاصل کرنے کی آزادی ہو۔ چنانچہ فیئر فیکس کاؤنٹی کے اسکولوں میں بھی اب بچوں کو جنسی تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ خواہ ان کے والدین پسند کریں یا نہ کریں۔

دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کی ڈسٹرکٹ سٹی کونسل کو بھی پچھلے دنوں جوش آیا اور کونسل میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہر سال بے شمار کم عمر بچّوں کو جنسی جرائم کی پاداش میں جو سزائیں دی جاتی ہیں ان سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ موجودہ "فرسودہ" قانون میں تبدیلی کر دی جائے' یہ تبدیلی کیا ہے ؟ بارہ سال کی عمر سے بڑے بچّے لڑکے لڑکیاں، اگر اپنی مرضی سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں تو اس پر قانون کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے' ہم عمر کمسن بچوں کا جنسی اختلاط جُرم نہیں ہونا چاہیئے' اگر بچّوں کی عمر میں چار سال تک کا تفاوت ہے تو جنسی تعلقات کے جُرم میں لڑکوں کو یا لڑکیوں کو سزا سے مبرّا کر دینا چاہیئے۔ اِس تجویز کی حمایت میں بھی بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ اخباروں میں اڈیٹوریل لکھے گئے۔ ان سب کی دلیل یہ تھی کہ بھاتی بات یہ ہے کہ کم عمر بچے تو کُھلے عام جنسی تعلقات قائم کر رہے ہیں۔ اکثریت قانون کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ مگر جو پکڑا جاتا ہے اسے "آبروریزی" کے جُرم میں سزا دی جاتی ہے۔ جب یہ عمل اتنے بڑے پیمانے پر جاری ہی ہے تو پھر اسے "خلافِ قانون" قرار دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ دو تین دن تک اِس موضوع پر بحث مباحثہ جاری رہا۔ حامیوں اور مخالفوں نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ مخالفوں کا اعتراض یہ تھا کہ چھوٹے بچّوں کو پہلے ہی حد سے زیادہ کُھلی چھٹی ملی ہوتی ہے۔ نو دس سال کی عمر میں لڑکیاں بن بیاہی مائیں بن رہی ہیں اگر انھیں قانون کا ڈر بالکل نہ رہا تو اس نسل کا کیا حال ہوگا ؟

اِس کے برعکس بل کے حامیوں کا کہنا ہے کہ منافقت سے کیا فائدہ ہے ؟ ہمیں حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ یہ ایک کُھلی حقیقت ہے کہ چھوٹے بچے کھلے عام "جنسی

تعلقات" قائم کرتے ہیں۔ اکثریت ایسی ہے جن کے بارے میں کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ مگر جو پکڑے جاتے ہیں۔ قانون ان کو سزا دیتا ہے آخر اِس ردِّعمل کی کیا وجہ ہے؟ ایک چودہ سالہ لڑکے نے اس ضمن میں جو تبصرہ کیا وہ بہت دلچسپ ہے۔ اس نے ایک اخبار کے رپورٹر سے کہا کہ بڑے لوگ تو جو چاہے کرتے پھرتے ہیں ساری پابندیاں بچّوں پر ہی عائد کی جاتی ہیں۔ دیکھیئے نا۔ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی ؟ لڑکا کم عمر ہو یا بڑی عمر کا اور لڑکی کسی بھی عمر کی ہو۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے تعلقات قائم کرتے ہیں تو اس پر قانون کو کیا اعتراض ہے ؟

دو تین دن کی گہما گہمی کے بعد بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ فی الحال اس "سیکس بل" کو ملتوی کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد بہت سے والدین نے اطمینان کا لمبا سانس لیا ہے مگر بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتے گی ؟

ڈونا ایک ۱۹ سالہ خوش رو دوشیزہ تھی۔ اس کا ۲۱ سالہ شوہر مائیکل ہاف مین ایک کلرک تھا۔ ان کی شادی کو صرف تین ماہ گزرے تھے۔ لیکن ڈونا اپنے شوہر سے بیزار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ جان پینکرٹ کے ساتھ مل کر اپنے شوہر کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔ پینکرٹ نے اپنے چار دوستوں کو بھی سازش میں شریک کر لیا۔ جس دن مائیکل ہاف مین کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا اس روز ڈونا بھی اس جگہ موجود تھی اور نشہ آور سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔ اسے فکر یہ تھی کہ قتل کے بعد ہاف مین کی لاش کو ٹھکانے کس طرح لگایا جائے گا۔ اور وہ خود قتل گاہ سے کس طرح واپس جائے گی؟ (یہ تفصیلات بعد میں قاتلوں نے اپنی شہادتوں میں بیان کی ہیں۔ ان سب نے اقرارِ جُرم کر لیا ہے)۔

دوسرے دن ڈونا نے اپنے شوہر کو کار میں بٹھایا اور اس جگہ پہنچ گئی جہاں اس کا بوائے فرینڈ اور چار دیگر افراد منتظر تھے۔ ہاف مین کار سے باہر آیا تو اسے مسلّح آدمی

نظر آتے۔ اس نے بھاگنا چاہا مگر فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس پر گولیوں کی بارش ہو گئی اور وہ مر گیا۔ قاتلوں نے لاش کو اسی جگہ چھپا دیا۔ اور گھر چلے آتے۔ ڈونا نے پولیس کو اپنے شوہر کی گمشدگی کے بارے میں فون کر دیا۔ اور تین چار گھنٹے بعد پولیس کو اطلاع دی کہ اسے اپنے شوہر کی ایک تحریر ملی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہاف مین کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ پولیس کی رہنمائی کرتے ہوتے ڈونا انھیں اپنے شوہر کی لاش تک لے گئی۔

مگر پولیس کو شبہ ہو گیا تھا۔ پولیس نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ تحریر خود ڈونا کی ہے۔ بعد میں کڑیاں ملتی چلتی گئیں اور پولیس نے پانچوں قاتلوں کو گرفتار کر لیا انھوں نے جھٹ اعترافِ جرم کر لیا۔ مگر ساتھ ہی بتایا کہ ڈونا بھی منصوبے میں شامل تھی اور شوہر کو قتل کرنے کے معاوضے میں اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے دوستوں کو بیس بیس ڈالر بھی عنایت کیے تھے۔

اب ڈونا پر مقدمہ چل رہا ہے۔ پہلے دن وہ عدالت میں آئی تو پھٹے پرانے لباس میں تھی مگر دوسرے دن سے اس کا حلیہ بدل گیا۔ اس کے بال خوب صورتی سے بنے ہوتے تھے۔ لباس دلکش تھا اور وہ بڑے دلنواز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ڈونا کی ایک پڑوسن نے بتایا کہ شادی کے بعد ڈونا اکثر راتیں گھر سے باہر گزارتی تھی اور اگر کبھی گھر میں شوہر کے ساتھ رہتی بھی تھی تو دونوں ہر وقت جھگڑتے رہتے تھے۔ قوی امکان یہی ہے کہ ڈونا کے خلاف الزام ثابت ہو جائے گا مگر اس داستان کا دلگداز پہلو یہ ہے کہ ڈونا نے اپنے شوہر کی زندگی کی قیمت محض ایک سو ڈالر ڈالی ذرا غور تو فرمایئے۔

شوہر فروختند دچہ ارزاں فروختند !

بیوی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوتے عدالت میں بتایا کہ مجھے پینکریٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ جہاں میں جاتی میرا پیچھا

کرتا، مجھ پر آوازے کستا۔ یہاں تک کہ وہ رات کو میرے مکان کی بالکونی میں آ کر سو جاتا تھا اور مجھے دھمکیاں دیا کرتا تھا کہ میں تمھیں اپنا بنا کر رہوں گا۔ جب پوچھا گیا کہ تم اس کے ساتھ اس کے فلیٹ پر کیوں گئی تھیں ؟ تو ڈونا نے آنسو بھری آنکھوں سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور معصومیت سے کہا کہ وہ مجھے زبردستی مجبور کر کے۔ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ کوئی راز کی بات کرتے تھے تو مجھے کمرے سے باہر نکال دیا کرتے تھے مگر مجھے شبہ ضرور ہوا تھا کہ یہ لوگ میرے شوہر کو نقصان پہنچانے کی سازش کر رہے ہیں۔ جب میں نے اپنے شوہر کو خبردار کرنے کی کوشش کی تو اس نے میرا مذاق اُڑایا اور کہا کہ دیکھوں گا وہ میرا کیا بگاڑتا ہے۔

لیکن ڈونا کے بیان میں اتنی خامیاں اور غلط بیانیاں تھیں کہ اس کے بیان کی صداقت پر یقین کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ دیکھیے اس "بادفا بیوی" کو عدالت کیا سزا دیتی ہے؟

اداکارہ ایلزبیتھ ٹیلر جو گزشتہ دنوں ایک ڈرامے میں کام کر رہی تھیں ایک بار پھر سکینڈل کا موضوع بنی ہوتی ہیں۔ گرما گرم خبر یہ ہے کہ وہ اپنے موجودہ ساتویں شوہر سے بیزار ہیں۔ اور ان سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے نئے محبوب سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ یہ صاحب ان کے نئے ڈرامے کے پروڈیوسر ہیں۔

ایلزبیتھ ٹیلر کے عملے نے اس خبر کی پُرزور تردید کی اور کہا کہ ایلزبیتھ ٹیلر کے بارے میں اس سے پہلے بھی اس قسم کی افواہیں اخبار والے اُڑاتے رہے ہیں۔ ان میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ ایک خاتون کالم نویس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوتے لکھا کہ اخبار والے اس قسم کی افواہیں اُڑاتے تو رہتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اکثر یہ افواہیں پُرزور تردید کے باوجود درست ثابت ہوتی ہیں۔

ایلزبیتھ ٹیلر کی عمر اب ۴۹ سال ہے۔ ان کا وزن پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا

ہے لیکن چہرے کی ملاحت ، دلکشی اور معصومیت میں ابھی تک فرق نہیں آیا ہے۔ ان افواہوں کی ایلزبیتھ ٹیلر کے شوہر نے بھی تردید کی ہے مگر سب سے دلچسپ تبصرہ ایلزبیتھ ٹیلر کی والدہ نے کیا۔ انھوں نے شکوہ کیا کہ اخبار والے تو ہمیشہ سے میری بچی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوتے ہیں اور اس کو بدنام کرنے کے لیے من گھڑت کہانیاں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ میری معصوم بچی بالکل گھریلو اور سادہ لڑکی ہے۔ اور گھریلو زندگی بسر کرنا چاہی ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے والدہ صاحبہ کا بیان۔ جہاں تک گھریلو زندگی کا تعلق ہے، حقیقت ہے کہ شادی کے بعد ایلزبیتھ ٹیلر نے کچھ عرصے نہایت ہی خالص قسم کی گھریلو زندگی بسر کی ہے اور اپنے تازہ ترین شوہر سے ان کی محبت کی کہانیاں ضرب المثل کے طور پر اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

مگر انجام ۔؟ وہی علیحدگی، نیا رومان، نئی شادی!

مذہب اور معاشرہ

مغربی ممالک میں یہ رجحان بہت عام ہے کہ حیلے بہانے اسلام اور مسلمانوں پر لمہ چینی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے ہ اس معاملے میں یورپ اور امریکہ کے تمام اخبارات ہم خیال اور ہم زبان ہیں۔ ان ے تعصب کا یہ عالم ہے کہ اسلام یا مسلمانوں میں انھیں کوئی خوبی نظر نہیں آتی اگر کوئی وبی نظر آتی بھی ہے تو یا تو اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر اس کی نفی کرنے کے یے کوئی ایسا عُذر تلاش کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا احسن پہلو ناپید ہو جاتا ہے۔

سیاسی قتل دُنیا کے ہر مُلک میں ہوتے ہیں۔ قاتلانہ حملے آج کے معاشرے کا ول ہیں۔ دُنیا کا کوئی مُلک اِس سے محفوظ نہیں ہے۔ اہم شخصیات پر قاتلانہ حملہ کی وجوہ ہوتی ہیں نمبر ایک سیاسی اور نمبر دو حملہ کرنے والے کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت۔ ن اسے کیا کہیئے کہ مغربی اخبارات اس موضوع پر بھی اپنی تعصب کی عینک اُتارنے کو ار نہیں ہوتے۔

گزشتہ دنوں روم میں پوپ پر قاتلانہ حملہ ہُوا تو ابتدائی چند گھنٹوں میں کسی کو ا نہ ہو سکا کہ قاتلانہ حملہ کا مرتکب کون ہے۔ کہاں کا ہے۔ کس قوم اور مذہب سے ق رکھتا ہے اور اِس اقدام کا محرک کون سا جذبہ ہے؟ لیکن جب تصدیق ہو گئی کہ

حملہ آور ایک مسلمان تُرک محمد علی آغا ہے تو ساری دُنیا تے یورپ میں تہلکہ مچ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں کی دبی ہوئی زہریلی نفرت کو ایک بار پھر ظاہر ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ اخبارات نے بال کی کھال نکالنی شروع کر دی۔ حملہ آور کون ہے اس کا خاندانی اور سیاسی پس منظر کیا ہے۔ کس جماعت یا سیاسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے؟ لیکن اِن تمام امور پر خیال آرائی کرتے ہوئے یہ نکتہ پیش نظر رہا کہ حملہ آور ایک مسلمان تُرک ہے۔

اخبارات نے خصوصی نمائندے بھیجے اور حملہ آور کی ماں اور بھائیوں سے انٹرویو لینے شروع کر دیئے۔ اسی روز واشنگٹن میں ٹیلی ویژن پر ایک خصوصی پروگرام پیش کیا گیا جس میں تُرکی کے سفیر تشریف لاتے۔ انٹرویو کرنے والے نے ان سے یوں جرح شروع کر دی جیسے وہ کسی عدالت میں موجود ہیں اور ملزم کو قتل پر اُکسانے کے وہی ذمہ دار ہیں۔ ان پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ انٹرویو کرنے والے کو یہ تشویش اور حیرت تھی کہ ایک شخص جس کا سیاسی اور مُجرمانہ ریکارڈ اتنا خراب تھا اور جو ایک سنگین جُرم میں سز بھی بھگت رہا تھا وہ جیل سے کیوں کر فرار ہوا۔ تُرکی سے باہر کیسے گیا دوبارہ تُرکی واپ کیسے پہنچ گیا؟ اسے پاسپورٹ اور ویزا کیسے مل گیا؟ اسے پیسہ کہاں سے ملا؟ تُرکی سفیر نے بہت تحمل اور بُردباری کا مظاہرہ کیا ورنہ جی میں آتا تھا کہ جواب میں ان سے دریافت کیا جائے کہ حضور امریکہ میں جو ہر روز قیدی جیل سے فرار ہو جاتے ہیں اور پکڑے نہیں جاتے اور برسوں اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے؟

انٹرویو کے بعد دوسرے حضرات نے تبصرے شروع کر دیئے اور تان اس پر ٹوٹی کہ ترکی میں جمہوریت نہیں ہے۔ اِس لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور وہاں کٹر مذہبی جنو موجود ہیں اور جو اسلام کے نعرے بلند کر رہے ہیں اور ایسے لوگوں سے کسی بھلائی کی تو نہیں رکھی جا سکتی لیکن سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ کئی تبصرہ نگاروں نے قاتلانہ

کے پس منظر میں اسلام کا ہاتھ دریافت کر لیا۔ واشنگٹن پوسٹ جیسے ثقہ اور ذمہ دار اخبار نے نمایاں طور پر ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان ہی تھا "اسلام کا تاریک پہلو" اور اس میں تبصرہ نگار یہ دُور کی کوڑی لاتے تھے کہ پوپ پر جو قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ یہ دراصل اسلامی اندازِ فکر کا ہی نتیجہ ہے اور اسلام کے فلسفے کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ قتل و غارت۔ بربادی اور نفرت انگیزی پر ہی یقین رکھتے ہیں۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ چند ہفتے پہلے امریکی صدر ریگن صاحب پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اور چند دنوں کی قیاس آرائیوں کے بعد اخبار نویس اِس نتیجے پر پہنچے کہ قاتلانہ حملہ کرنے والا ایک بگڑا ہُوا نوجوان ہے جس کی نفسیاتی اور ذہنی تربیت میں خامی اور کجی رہ گئی ہے حالانکہ اس کے ماں باپ بہت شریف اور شائستہ لوگ ہیں۔ سبب یہ بتایا گیا کہ اسے ایک اداکارہ سے محبت ہے اور وہ چاہتا تھا کہ اپنی محبوبہ کو کوئی ایسا کارنامہ کر کے دکھائے کہ دُنیا دنگ رہ جائے اور محبوبہ کے دل میں بھی اس کی قدر و منزلت پیدا ہو۔ لیجئے فی الحال اِس نکتے پر آ کر تان ٹوٹ گئی ہے۔ اِس حملے کے پس منظر میں کسی مذہبی پہلو کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

پوپ نے چند روز کے بعد یہ بیان دیا کہ مَیں اپنے قاتل کے لیے دُعائے خیر کرتا ہوں اور دُعاگو ہوں کہ خدا اسے سیدھا راستہ دکھائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے اس شخص کو معاف کر دیا ہے۔ لیجئے پھر کیا تھا۔ اخباروں نے کالم بھرنے شروع کر دیئے کہ دیکھا یہ ہے فرق عیسائی اور مسلمان میں۔ ایک کالم نگار نے لکھا کہ عیسائیت میں یہ جو فلسفہ ہے کہ اگر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال اس کے سامنے کر دو یہ بعض حالات میں قابلِ عمل نہیں ہے خصوصاً جب اسلامی جنونی کے ساتھ واسطہ پڑ جائے تو اِس قسم کے فلسفے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ دیکھا آپ نے اس کو کہتے ہیں ماروں گھٹنا، پھوٹے آنکھ۔

تُرکی میں جب سے جمہوریت معطل کر کے فوجی حکومت قائم ہوتی تھی امریکی پولیس نے لے دے شروع کر رکھی تھی کہ دیکھئے کیسا ظلم ہے کہ فوج نے سیاست کو ختم کر دیا ہے اور پکڑ دھکڑ شروع کر دی ہے جو سراسر ظلم اور ناانصافی ہے مگر جب پوپ پر حملہ ہوا تو بعض اخبارات نے تُرکی میں دہشت پسندوں کی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی کہ ملک میں فوجی حکومت قائم ہونے سے پہلے وہاں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ چند مہینوں میں سیاسی انتقام کے نام پر بیس ہزار کے قریب افراد قتل کر دیئے گئے تھے۔ اور کسی کی جان مال و آبرو محفوظ نہ تھی۔ اِن حالات میں فوج نے نظام حکومت سنبھال کر سخت اقدامات کیے اور غنڈہ گردی اور دہشت پسندی پر قابو پا لیا ورنہ لوگوں کی زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔ مگر خلاصہ آخر میں یہی نکالا گیا کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے تُرکی کو اسلام سے نجات دلانے کی کوشش کی تھی اور تُرک "بندے دے پُتر" بھی بننے لگے تھے مگر اسلامی تحریکوں نے پھر وہاں جنونیوں کو جنم دینا شروع کر دیا اور جب سے اسلام کا چرچا شروع ہُوا ہے ترکی پھر پس ماندہ اور ظلم ناانصافی کا مرکز بن گیا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہر روز آئرلینڈ و انگلستان سے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی باہمی کش مکش کے نتیجے میں قتل و غارت کی خبریں موصول ہوتی ہیں۔ لیکن اِس تمام کارروائی میں مغربی اخبارات کو "عیسائیت کا تاریک پہلو" نظر نہیں آتا اور نہ ہی یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مذہبی جنونی (جو عیسائیت کے دو فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں) اِس بربادی کے ذمہ دار ہیں۔

آئرلینڈ کی تحریک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہاں کے لوگ انگلستان پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے مقامی لوگوں کے حقوق غصب کر لیے ہیں اور جابرانہ نظام قائم رکھا ہے، وہ اپنی سرگرمیوں کو "تحریک آزادی" کا نام دیتے اور اخبارات بھی دہشت پسندوں کو "ہیرو" کا خطاب عطا کرنے میں تامّل سے کام نہیں لیتے جب آئرلینڈ کے لوگ کہتے ہیں

کہ ہمیں کچلنے کے لیے برطانوی فوج نے ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔ تو کسی کو یاد نہیں آتا کہ برطانوی حکومت طاقت کے ذریعے اِس مسئلے کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے اور مقامی آبادی کے سیاسی حقوق کو تسلیم نہیں کرتی۔ اِس ضمن میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب کی تحریک کو یاد کیجئے اور پھر ذہن دوڑائیے کہ تقریباً ایسی ہی صورتِ حال میں جب پاکستانی فوج نے وہاں کارروائی شروع کی تھی تو مغربی ملکوں کا ردِّ عمل کیا تھا یا شاید شاعر نے اِسی موقع کے لیے کہا ہے ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

صدر ریگن نے انتخابی مہم کے دوران نعرہ لگایا تھا کہ روس کے خلاف سخت گیری کی پالیسی اختیار کریں گے۔ مُلک کے معاشرتی اور معاشی حالات کو درست کر دیں گے۔ افراطِ زر کو ختم کر دیں گے۔ لوگوں کو ٹیکسوں کے بار سے نجات دلائیں گے اور خارجہ پالیسی کے ضمن میں امریکی حکومت کی کمزوری کو طاقت اور مضبوطی میں بدل دیں گے مگر پانچ ماہ گزرنے کے بعد حالات پر نظر ڈالی تو جاتے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کوئی مقصد بھی اب تک پورا نہیں ہو سکا ہے۔ اگرچہ گا ہے بگا ہے یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے۔ بہت جلد "سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ بے روزگاری بڑھ گئی ہے اگرچہ افراطِ زر میں ۳ فیصد کمی ہوئی ہے۔

صدر نے ٹیکسوں پر نظرِ ثانی کی جو تجویز پیش کی ہے اس پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ مخالفین کا کہنا ہے کہ یہ پالیسی امیروں کو ٹیکسوں سے نجات دلا کر غریبوں پر ٹیکسوں کا بوجھ ڈالنے کی موجب بنے گی، بہت بڑے طبقے میں خصوصاً سیاہ فام آبادی میں پہلے یہ تاثر موجود ہے کہ صدر ریگن امیروں کے صدر ہیں۔ اخبارات میں اس قسم کے مضمون اور تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں کہ اس حکومت کے دَور میں امیر اور زیادہ امیر اور غریب تر

ہو جائیں گے۔ صدر نے سوشل سیکورٹی کی اسکیم پر نظر ثانی کی ہے۔ بوڑھوں کی امداد میں کمی کرنے کی تجویز پیش کی ہے جس کی وجہ سے بوڑھوں کی مشکلات میں اور زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اندازہ ہے کہ بوڑھے اور بے سہارا لوگوں کی زندگی اب زیادہ مشکل اور تلخ ہو جائے گی، یوں تو اس پالیسی کا اثر سبھی پر پڑے گا لیکن سیاہ فام لوگ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوں گے جن کی زندگی پہلے ہی ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبی ہوتی ہے اور مہنگائی نے جن کی کمر توڑ دی ہے۔ گزشتہ موسم سرما میں بے شمار گھرانے بغیر حرارت کے زندگی گزارنے پر مجبور تھے، عام لوگوں کی مشکلات بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب صدر ریگن پر قاتلانہ حملہ ہوا تو سب سے پہلا قیاس یہی تھا کہ حملہ آور غالباً کوئی سیاہ فام ہے۔ میں ایک ریسٹوران میں تھا جب ایک صاحب نے یہ خبر سُنائی۔ بہت پریشان نظر آ رہے تھے مگر ریسٹوران کی سیاہ فام ویٹرس نے یہ خبر سُن کر بے نیازی سے سوال کیا۔ "قاتل کون ہے؟ جواب ملا۔

"ابھی تک پتہ نہیں چلا۔"

لڑکی نے تلخی سے کہا "کوئی غریب آدمی ہوگا اِس لیے کہ صدر ریگن امیروں کے صدر ہیں۔"

خارجہ پالیسی میں بھی زبانی دھواں دھار تقریروں کے سوا امریکی پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی نظر نہیں آتی یہاں تک کہ افغانستان پر روس کے قبضے کے بعد سابق صدر کارٹر نے روس کے لیے گندم ارسال کرنے پر جو پابندی لگائی تھی صدر ریگن نے کافی عرصہ خوض کے بعد وہ بھی ختم کر دی ہے۔ سبب یہ بتایا گیا ہے کہ کاشت کاروں کو بہت نقصان ہو رہا ہے مگر کاشتکار کہتے ہیں کہ ہم نے صبر کر لیا تھا۔ دراصل نقصان بڑے بڑے مگر مچھ قسم کے برآمد کنندگان کو ہو رہا تھا جن کی بھلائی کے لیے یہ اقدام کیا گیا ہے۔ واشنگٹن اسٹار ایسا اخبار ہے جس میں گاہے گاہے موجودہ حکومت پر شدید نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اسٹار نے لکھا کہ صدر نے تو کہا تھا کہ روس کو جارحانہ کارروائیوں پر خاطر خواہ سزا دی جائے

گی مگر پہلی سزا یہ ہے کہ روس کو فاقہ کشی سے بچایا جا رہا ہے تاکہ وہ یہی رقم ہتھیاروں پر صرف کر سکے۔ اور دوسری طرف بہت سے تاجر اور صنعت کار حکومت پر زور ڈالتے ہیں کہ پھر ہم ہی پر یہ پابندی کیوں ہے کہ روس کو اِس قسم کی مصنوعات برآمد نہ کی جائیں جو روس کی ہتھیار سازی کی صنعت کو فائدہ پہنچا سکیں۔ امریکہ میں ہر کام کا ہونا یا نہ ہونا اِس بات پر منحصر ہے کہ "لابی" کتنی مضبوط ہے۔ اگر صنعت کاروں کی لابی میں جان ہوتی تو وہ بھی اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب بتائیے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت سرمایہ داروں کی پشت پناہ ہے کیا وہ غلط کہتے ہیں؟ ایک اخبار نے لکھا کہ کاشت کاروں کی بہبود کے نام پر دُنیا کو روسی استحصار کی آگ میں جھونکا جا رہا ہے یہاں تک کہ خود امریکی قوم کا مستقبل بھی داؤ پر لگا ہوا ہے۔

مگر حضرت! انقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے؟

صدر ریگن کے برسر اقتدار آنے سے پہلے بھی امریکی صدر فنکاروں کے مداح رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ صدر کینیڈی کے منتخب ہونے پر خصوصی تقریب کی مہمان خصوصی مارلن مونرو تھیں جن کے بارے میں اب یہ نیا انکشاف کیا گیا ہے کہ ان سے صدر کینیڈی کے خصوصی مراسم تھے۔ بعض اخبارات کہتے ہیں کہ وہ "بڑے کینیڈی" کی محبوب نظر تھیں مگر ایک صاحب نے یہ تحقیق کی ہے کہ وہ "رابرٹ کینیڈی" کی منظور نظر تھیں۔ بہرحال صدر کینیڈی کے دَور میں فن کاروں کو گاہے گاہے وہائٹ ہاؤس میں مدعو تو کیا مگر فن کاروں خصوصاً فلمی فن کاروں پر ان کی مہربانیاں اتنی زیادہ نہ تھیں۔

ہاں۔ تو ذکر یہ تھا کہ صدر ریگن کے عہدہ سنبھالتے ہی فن کاروں خصوصاً فلمی اداکاروں کی آؤ بھگت میں اضافہ ہو گیا۔ وہائٹ ہاؤس میں اداکاروں کی آمد و رفت عام ہو گئی یہاں تک کہ جب وہائٹ ہاؤس میں چیدہ چیدہ لوگوں پر مشتمل دعوتیں ہوتی ہیں ان میں بھی اداکار ضرور موجود ہوتے ہیں۔ کئی اداکاروں کو اہم عہدے دیئے گئے ہیں۔ کچھ

دن قبل اداکار جان گیون کو میکسیکو کا سفیر منتخب کیا گیا ہے اور خیال ہے کہ چند اور اداکاروں کو بھی انتظامیہ میں ممتاز عہدوں سے نوازا جائے گا۔ اس سلسلے میں اداکار چارلٹن ہیسٹن کا بھی نام لیا جا رہا ہے۔ چند اور اداکار بھی مستقبل قریب میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز کر دیئے جائیں گے۔ امریکی عوام کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنے فن کاروں اور اداکاروں کی بے حد قدر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی عہدہ دیا جاتے تو وہ اداکار کی قدر افزائی نہیں ہے بلکہ خود عہدوں کے مرتبے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی محفل میں سیاست دان اور اداکار شریک ہوتے ہیں تو زیادہ اہمیت اداکاروں کو حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک تقریب میں جب فرینک سیناترا نے گانا گایا تو نینسی ریگن جو مہمان خصوصی تھیں مسحور ہو کر سنتی رہیں۔ ان کے دونوں ہاتھ ان کے سینے پر تھے اور آنکھوں میں ایک سرور کی کیفیت تھی۔ ان کی اضطراری کیفیت اور اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ گانا ختم ہونے سے پہلے پہلے ہی وہ سمجھیں کہ شاید نغمہ ختم ہو گیا ہے۔ وہ اپنی مہمان خصوصی والی کرسی چھوڑ کر بے اختیار سٹیج کی طرف بھاگیں مگر جب دیکھا کہ گانا ختم نہیں ہوا ہے تو رُک گئیں۔ چند منٹ تک وہ منتظر کھڑی رہیں اور جب فرینک سیناترا نے گانا ختم کیا تو دوڑی ہوتی گئیں اور فرینک سیناترا کو چُوم لیا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بڑی گرم جوشی اور خلوص سے اس کی تعریف کی۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ نینسی ریگن نے اس روز بالکل اسی طرز عمل کا مظاہرہ کیا جو سکول کی لڑکیاں اپنے مقبول فنکاروں کو دیکھ کر کیا کرتی ہیں۔

امریکہ میں خود نوشت سوانح عمریاں لکھنے کا رواج اب قریباً بیماری کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہر قابل ذکر (اور ناقابل ذکر) ہستی اپنی سوانح عمری لکھتی ہے یا لکھواتی ہے اگر واقعات دلچسپ ہیں یا لکھنے والی شخصیت پُرکشش ہے تو یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد

میں فروخت ہوتی ہیں اور ان کی فلمیں بھی بنائی جاتی ہیں۔

سابق صدر آنجہانی جان ایف کینیڈی کی بیگم "جیکولین" کے نام سے تو آپ خوب واقف ہیں، ان کے بارے میں بے شمار کہانیاں مشہور ہیں اور "اوناسس" سے شادی کرنے کے بعد ان کی شخصیت اخبار نویسوں کے لیے بہت پُرکشش رہی۔ اوناسس کی وفات کے بعد اوناسس کی ایک محبوبہ نے یہ انکشاف کیا کہ اوناسس جیکولین سے نالاں تھے اور اگر چند ماہ اور زندہ رہتے تو جیکولین کو طلاق دے دیتے۔ لیکن زندگی نے مہلت نہ دی حالانکہ انھوں نے طلاق کے لیے کاغذات اپنے وکیل کے سپرد کر دیئے تھے۔

اوناسس کی وفات کے بعد بھی جیکولین کی شخصیت کا سحر کم نہ ہوا۔ اوناسس کی بیٹی کے ساتھ ان کی مقدمہ بازی ہوتی اور بالآخر فیصلہ ہو گیا اور انھیں ایک خطیر رقم حاصل ہوئی۔ ان دنوں بھی ان کے بارے میں کبھی کبھی کوئی اسکینڈل منظر عام پر آ جاتا ہے پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ وہ ایک ارب پتی سے رومان کر رہی ہیں۔

ایک امریکی ٹیلی ویژن ادارہ اے بی سی اِن دنوں جیکولین کی زندگی کے بارے میں ایک فلم بنانے میں مصروف ہے۔ جس میں جیکولین کی ابتدائی زندگی سے لے کر ان کی کینیڈی سے ملاقات اور شادی تک کے واقعات دکھائے جائیں گے۔ اِس فلم کے لیے ایک لڑکی "جیک لین اسمتھ" کا انتخاب کیا گیا ہے جو صورت شکل میں جیکولین سے مشابہ ہے۔ جیکولین ایک زمانہ میں واشنگٹن ٹائمز اور ہیرالڈ میں فوٹوگرافر کے طور پر کام کر چکی ہیں اور ان کی تنخواہ محض ۴۲ ڈالر فی ہفتہ تھی۔ پچھلے دنوں ان مناظر کی فلم بندی کی گئی جب جیکولین فوٹوگرافر کے طور پر کام کیا کرتی تھی۔

اِس فلم میں ان کی پانچ سال کی عمر سے لے کر صدر کینیڈی کے قتل تک کے واقعات دکھائے جائیں گے۔ فلم کے واقعات کے مطابق جیکولین اور کینیڈی کی ملاقات واشنگٹن میں ایک ڈنر پر ہوتی اور اگلے سال ہی وہ ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے۔ مشہور ہے

کہ صدر کینیڈی جیکولین پر دل و جان سے عاشق تھے۔ یہ اور بات ہے کہ پچھلے دنوں اپنے زمانے کی ایک مشہور فلم ایکٹریس جین ٹیرنی نے اپنی سوانح میں یہ انکشاف کیا ہے کہ کینیڈی ان کے زُلف کے اسیر تھے اور جن دنوں میں وہ جیکولین سے شادی کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے اسی زمانے میں جین ٹیرنی سے بھی شادی کی درخواست کرتے رہتے تھے۔ جیکولین یا ان کے خاندان کے لوگوں نے اس فلم کی فلم بندی کو روکنے کے سلسلے میں فی الحال کوئی کارروائی نہیں کی ہے۔

تلخ حقائق!

امریکہ کو دُنیا کا خوشحال ترین مُلک کہا جاتا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں دولت کی ریل پیل ہے۔ کاروں کی قطاریں ہیں۔ خوشحالی اور دولت مندی کا دور دورہ ہے۔ دُنیا میں اگر کہیں جنت ہے تو وہ امریکہ ہے۔

آج سے چند سال پہلے تو یہ قیاس آرائیاں کسی حد تک دُرست تھیں۔ امریکی معاشرہ دُنیا کے دوسرے مُلکوں کے مقابلے میں خوشحال تھا اور بے روزگاری یا افراطِ زر کی شکایت بھی اتنی عام نہ تھی لیکن گزشتہ تین چار برسوں میں دُنیا کے مالی نظام نے کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے، خصوصاً تیل کی قیمتوں میں گرانی کی وجہ سے ساری دنیا کی معیشت میں ایسا تہلکہ مچا ہے کہ امریکہ بھی اس "بربادی" سے محفوظ نہیں رہ سکا اور اس کا اور بیشتر مغربی ممالک کا یہی حال ہے۔ انگلستان جس نے ایک زمانے میں دُنیا بھر کی دولت سمیٹ لی تھی اب شدید معاشی بحران سے دوچار ہے۔ بے روزگاری انتہا کو پہنچ گئی ہے افراطِ زر بے اندازہ ہے اور گرانی عام تو کیا خاص آدمیوں کے بس سے باہر ہو گئی ہے یورپ کے دوسرے "ترقی یافتہ" ملکوں کا بھی یہی عالم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند سال پہلے تک امریکہ ان "بلاؤں" سے محفوظ تھا۔ چیزیں سستی تھیں اور افراط سے تھیں، روزگار کی کمی نہ تھی۔ معیشت میں استحکام تھا۔ افراطِ زر بہت کم تھا چنانچہ لوگ خوشحال

اور خوش باش تھے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں بے روزگاری ۷½ فیصد سے بڑھ گئی ہے جو اس ملک کے لیے بہت زیادہ ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض اشیاء کی گرانی میں کچھ کمی ہوئی ہے اور افراطِ زر میں بھی معمولی کمی ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود حالات ناقابلِ برداشت ہو چکے ہیں۔ یہ معیشت قرض کی بنیادوں پر قائم ہے اور حالت یہ ہے کہ قرضے کے سود کی شرح بیس اور بائیس فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ لوگوں کی قوتِ خرید جواب دے چکی ہے۔ مکانوں اور جائیدادوں کی خریداری بے حد کم ہے۔ گرانی سے لوگ چیخ رہے ہیں۔ بے روزگاری بڑھ چکی ہے۔ خاندان کا ہر فرد (بچے تک) کوئی کام کرنے پر مجبور ہیں اس کے باوجود گزارا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ لوگ دو دو تین تین جگہ پہ ملازمت کرتے ہیں۔ پھر بھی "قرضوں" کی ادائیگی مشکل اور زندگی کٹھن ہے۔ بڑی کاروں کی جگہ اب چھوٹی کاریں لے رہی ہیں اور پچھلے دنوں یہ مہم بھی چلائی گئی کہ مکانوں کا سائز کم ہونا چاہیئے۔ اور سینٹرل ائر کنڈیشننگ کے رواج کو بند کر دینا چاہیئے چونکہ اس طرح نہ صرف اخراجات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ بجلی بھی ضرورت سے زیادہ ضائع ہوتی ہے۔

گزشتہ چند ماہ کے دوران میرا اپنا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ امریکی قوم ہر چیز میں "اسراف بے جا" اور "ضیاع" کی عادی ہے۔ چھوٹی چھوٹی گھریلو ضرورتوں سے لے کر بڑی بڑی قومی ضروریات تک ہر معاملے میں فضول خرچی کا رواج ہے۔ محض کتوں بلیوں کی خوراک پر جو رقم صرف کی جا رہی ہے وہ دنیا کے کئی ملکوں کے بجٹ کے متوازن کرنے کے لیے کافی ہے۔ بے اندازہ بجلی محض ایئر کنڈیشنروں پر ضائع ہو رہی ہے کاروں کی بھاگ دوڑ میں حد سے زیادہ پٹرول پھونکا جا رہا ہے جو کہ آج کل معیشت کے لیے "رگِ جان" کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ لوگ جتنا کھاتے ہیں اس سے زیادہ میزوں پر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ پھینک دیا جاتا ہے۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں فضول خرچی اور اسراف بے جا

کا دَور دورہ ہے۔

لیکن یہ حالت کب تک رہے گی؟ اور امریکی معیشت اور معاشرہ کب تک تلخ حقائق کو نظر انداز کرتا رہے گا۔ اس ملک کی چمک دمک کے بارے میں تو آپ نے کچھ سنا اور پڑھا ہوگا۔ اب ذرا تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ کیجئے۔ بعض ماہرین نے گہری چھان بین کے بعد جو اعداد و شمار اور حقائق دریافت کیے ہیں ذرا ان کی ایک جھلک دیکھیے۔

ان کا بیان ہے کہ امریکہ کا نظام فرسودہ ہو چکا ہے اور جواب دیتا جا رہا ہے۔ صنعتوں کی حالت یہ ہے کہ مشینیں اور آلات پرانے ہیں اور تقریباً ازکار رفتہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ پرائیویٹ صنعتوں میں تو خیر ہر چیز پرانی اور سیکنڈ ہینڈ ہو چکی ہے۔ مگر حکومت جن مسائل کی نگران ہے۔ وہاں بھی ٹوٹ پھوٹ اور فرسودگی کا آغاز ہو چکا ہے۔ حکومت کی طرف سے عوام کو جو سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں ان میں انحطاط پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے نظامِ معیشت کا متاثر ہونا بھی ضروری ہے۔

تقریباً گزشتہ دس سال سے امریکہ میں عوامی سہولتوں میں انحطاط کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے جبکہ ان کو بدلنے کی رفتار بہت کم ہے۔ ثبوت کے طور پر یہ اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

امریکہ کے پانچ پُلوں میں سے ایک پُل اس قابل ہو گیا ہے کہ اس کی بہت بڑے پیمانے پر مرمت کی جائے۔ یا اس کو بدل دیا جائے اور نیا پُل تعمیر کیا جائے۔ قومی شاہراہوں کا نظام بھی فرسودہ ہے اور ہر چار میل میں سے ایک میل سڑک کی حالت ایسی ہے کہ اسے ازسرِ نو تعمیر کرنا ضروری ہے۔ ریل کی نصف سے زیادہ لائنیں تبدیلی کی محتاج ہیں۔ امریکی قید خانوں کی ایک چوتھائی تعداد ایسی ہے کہ وہاں سہولتیں ضرورت کے مقابلے میں بے حد کم ہیں۔ تقریباً پندرہ سو جیلوں میں قیدیوں کے لیے سہولتوں کا فقدان ہے جس کی وجہ سے آئے دن فسادات اور خون ریزی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں یہاں

تک کہ جج بہت سے قیدیوں کو مقررہ میعادِ قید سے پہلے ہی رہا کرنے پر مجبور ہیں تاکہ نئے قیدیوں کے لیے گنجائش پیدا کی جا سکے۔ بعض شہروں میں سیوریج کا نظام اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ سڑکوں پر بھاری ٹریفک کی آمد و رفت سے سڑکیں بیٹھ گئی ہیں۔ ڈسٹرکٹ کولمبیا (جس میں صدر مقام واشنگٹن واقع ہے) میں پانی کے پائپوں کی نصف سے زیادہ پائپ لائنیں تبدیلی کی محتاج ہیں۔ نیویارک شہر میں تقریباً ایک کروڑ گیلن پانی ہر روز اِس لیے ضائع ہو جاتا ہے کہ پانی کے پائپ پُرانے ہیں اور پانی رِس کر باہر نِکل جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جب تک اِن حالات پر توجہ نہ دی جائے اور ان کی اصلاح نہ کی جائے انحطاط کا یہ عمل زیادہ تیزی سے پھیلتا رہے گا، فائر اسٹیشن جیل خانے، باغ، لائبریریاں، بجلی گھر، پُل، سڑکیں، اسٹریٹ لائٹس، قومی شاہراہیں، سرکاری عمارتیں بھی مرمّت اور از سرِ نو تعمیر کی متقاضی ہیں۔ لیکن سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے پاس پیسے کی کمی ہے جس کی وجہ سے اصلاحِ احوال کی کوئی گنجائش فی الحال نظر نہیں آتی۔ ہر ریاست، شہر اور ادارے کا بجٹ گزشتہ کئی سال سے سُکڑتا ہوا رہا ہے۔ جب کہ اخراجات بڑھ رہے ہیں جس کی وجہ سے تعمیرِ نو اور مرمّت کا ہر پروگرام ملتوی ہو رہا ہے۔ قومی آمدنی میں کمی واقع ہو گئی ہے جبکہ اخراجات میں بے اندازہ اضافہ ہو چکا ہے۔ اگر ٹیکسوں میں اضافہ کیا جاتا تو عوام جو پہلے ہی ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ چیخ پڑیں گے اور ان کی قوتِ برداشت جواب دے جائے گی۔ اِس لیے آمدنی کے نئے ذرائع تلاش کرنے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔

یہ تو فلاحِ عامہ کے اداروں کی صورت حال ہے۔ اب ذرا افراد کی طرف آیئے، چند دن ہوئے "واشنگٹن پوسٹ" نے ایک نہایت دلگداز اسٹوری شائع کی۔ رپورٹر نارتھ ویسٹ واشنگٹن کے رہنے والے ایک شخص لیون انتھونی پورٹر سے مَیں ملنے گیا تو وہ ناشتے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ ناشتہ محض دلیہ کے پیالے پر مشتمل تھا۔ دوپہر کے

کھانے میں پورٹر مکھن لگے ہوئے توس کا سینڈوچ بنا کر کھا لیتا ہے۔ اس کا خاندان پندرہ افراد پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ رات کے کھانے میں عموماً ہڈیوں کی یخنی پی کر گزارہ کرتے ہیں۔ جہاں تک گوشت اور دودھ کا تعلّق ہے یہ لوگ کئی کئی ہفتے اِن چیزوں کی شکل تک نہیں دیکھتے۔ پورٹر کی ماں کو ہر ماہ ۴۸ ڈالر کی پبلک امداد ملتی ہے اور کھانے کے لیے ۱۴۰ ڈالر ملتے ہیں۔ لیکن واشنگٹن کی گرانی کے پیشِ نظر یہ رقم محض زندہ رہنے کے لیے بھی ناکافی ہے یہاں تک کہ پورٹر کی ماں میک فیڈن کے مطابق کئی بار تو خاندان کے لوگ فاقہ بھی کر لیتے ہیں۔

اِسی علاقے میں لیون پورٹر کی ایک پڑوسی خاتون میرن مارٹن اپنے چھ سال کی عمر کے جڑواں بچوں کو ناشتے میں محض کورن فلیکس کھلاتی ہے۔ دوپہر اور رات کے کھانے کے وقت عموماً یہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کبھی ان کے کوئی ہمدرد یا رشتے دار اِس خاندان کی امداد کے لیے ہمبرگر لا دیتے ہیں تو بچّوں کی عید ہو جاتی ہے۔ پوسٹ کے نمائندے نے لکھا کہ جب اس نے میرن مارٹن سے ملاقات کی تو سخت سردی پڑ رہی تھی اور وہ اپنے دونوں بچوں کو گود میں سمیٹے ہوئے حرارت پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی اِس لیے کہ گھر میں حرارت کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ مارٹن واشنگٹن کی ۱۳ ویں اسٹریٹ پر رہتی ہے اور اس نے بتایا کہ کبھی کبھی تو وہ بچّوں کا پیٹ پالنے کے لیے چوری کرنے پر بھی مجبور ہو جاتی ہے۔ پوسٹ کے نمائندے کا کہنا ہے کہ واشنگٹن میں ایسے خاندانوں کی کمی نہیں ہے اور نہ یہ اعداد و شمار موجود ہیں کہ امریکی دارالحکومت میں یا پورے ملک میں اِس قسم کے خاندانوں کی تعداد کتنی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ قوم کے دارالحکومت میں بھوک، افلاس اور مفلوک الحالی موجود ہے۔ یہ ایسے ملک کے لوگوں کی حالت ہے جہاں محض کُتّوں کی خوراک کے اشتہاروں پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کر دیئے جاتے ہیں۔

پوسٹ کے نمائندوں نے دو ہفتوں کی چھان بین کے بعد یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ اس قسم کے خاندانوں کی تعداد کتنی ہے اور ان کے مسائل کیا ہیں۔ سروے سے پتہ چلا ہے کہ ایسے خاندانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کا گزارہ رشتے داروں اور دوستوں کی مالی امداد پر ہو رہا ہے ورنہ بے شمار گھرانے ایسے ہیں جنھیں کھانے کو کچھ بھی میسّر نہیں ہے۔ پھر بعض گھرانوں کے بچّوں کو اسکول میں بھی ناشتہ مل جاتا ہے۔ لیکن یہ محض بچّوں تک منحصر ہے۔ اس لیے کہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد اسکول نہیں جاتی۔ اسکولوں سے جو معلومات حاصل کی گئیں ان کے مطابق اسکولوں میں بچّوں کی بہت بڑی تعداد باقاعدگی سے اسکول نہیں جاتی وجہ؟ ایک بچّے گونیگوری نے بتایا کہ وہ چھٹی جماعت میں ہے لیکن اس سال وہ تین ماہ تک اسکول نہیں جا سکا کیونکہ اس کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں تھے۔ گرنیگوری کی ماں نے بتایا کہ میرا بچّہ اسکول جانے سے گھبراتا ہے کیونکہ جب ٹیچر اس کے لباس کے بارے میں ریمارک پاس کرتی ہے تو سارے بچے ہنستے ہیں اور اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ یہ دُنیا کے امیر ترین ملک کے غریبوں کی حالت ہے۔ اس ملک کے عوام کی جو چاند تک پہنچ چکا ہے اور اب دوسرے ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے۔

یوں تو غُربت کا شکار گورے اور کالے سبھی ہیں مگر کالوں کی حالت زیادہ خراب ہے۔ ان کی آمدنی نسبتاً بہت کم ہے کیونکہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے دوسرے ان کے خاندان بڑے ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر پیلیٹی میک فیڈن کے خاندان کو دیکھئے وہ وہائٹ ہاؤس کے پارک کے سامنے ایک دفتر میں صفائی کے کام پر مامور ہے۔ اسے ۶۴ ڈالر فی ہفتہ تنخواہ ملتی ہے۔ مہینے میں ۳۵۸ ڈالر سرکاری امداد کے طور پر ملتے ہیں اور پھر خوراک کی امداد بھی ملتی ہے لیکن یہ رقم بارہ افراد کے خاندان کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ اس

لیے زیادہ تر رقم تو خوراک پر صرف ہو جاتی ہے اور خوراک بھی بہت کم اور برائے نام — زیادہ تر یہ لوگ پھلیاں اور آلو کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ گھر کا کرایہ ۶۰ ڈالر ہے لیکن پانی، بجلی اور گیس کے اخراجات بے پناہ ہیں۔ خصوصاً سردیوں میں یہ لوگ بہت زیادہ بجلی کا بل ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ حالانکہ وہ تمام وقت گھر کو گرم بھی نہیں رکھتے۔ بے شمار گھرانے ایسے ہیں جو محض دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے سارے ہفتے جدّوجُہد کرتے ہیں اور روکھی سُوکھی بھی نہیں کھاتے۔ امریکہ میں حکومت کی طرف سے "فوڈ سٹامپ" جاری کیے جاتے ہیں۔ یہ کم آمدنی والے لوگوں کی امداد کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن اخبار نے انکشاف کیا ہے کہ بہت سے لوگ "فوڈ سٹامپ" لے کر فروخت کر دیتے ہیں اور انھوں نے اسے بھی ایک کاروبار بنا لیا ہے۔ کم آمدنی والے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نشہ آور دواؤں اور شراب کا سہارا لینے پر مجبور ہے کیونکہ وہ اپنی معاشی پریشانیوں کو فراموش کرنا چاہتے ہیں۔ کئی گھرانے ایسے بھی ہیں جو اپنے بچّوں کو محض اس لیے اسکول بھیجتے ہیں تاکہ وہ اسکول میں لنچ کھا کر پیٹ بھر سکیں۔ اسکولوں میں بچّوں کی صحت کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ امریکہ کی بیس ریاستوں میں بچّوں کی بہت بڑی تعداد مناسب خوراک نہ ملنے کی وجہ سے صحت کی خرابی اور وزن کی کمی کا شکار ہے۔

ہمارے مُلک میں "پولیس" کی زیادتیوں کے قصّے آپ روز سُنتے ہیں مگر امریکہ میں بھی "پولیس" سے کوئی خوش نہیں ہے۔ شہری آزادیوں کے اداروں نے الزام لگایا ہے کہ معمولی الزامات میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو بھی پولیس ذلیل و خوار کرتی ہے، انھیں برہنہ کر کے تلاشی لی جاتی ہے حالاں کہ قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

آرلنگٹن (ورجینیا) کی ایک عورت کو اونچی آواز سے میوزک بجانے کے جُرم

میں گرفتار کیا گیا اور پولیس اسٹیشن میں اسے برہنہ کر کے تلاشی لی گئی۔ ایک عورت کی شکایت پر کہ اس کا پرس گم ہونے کی شکایت لے کر پولیس اسٹیشن گئی تو اسے تھانے میں بٹھا لیا گیا اور چودہ سالہ لڑکی کو ڈیڑھ ڈالر کی ٹافیاں چرانے کے الزام میں پکڑ لیا گیا اور اس کی تلاشی لی گئی۔ وکلاء کا کہنا ہے کہ پولیس وارنٹ کے بغیر کسی کے گھر کی تلاشی لینے کی مجاز نہیں ہے۔ پھر وارنٹ کے بغیر وہ کسی کے جسم کو ٹٹولنے کی حق دار کیسے ہو سکتی ہے؟ گزشتہ دنوں ٹی وی کے ایک پروگرام میں بتایا گیا ہے کہ سینکڑوں ادارے ایسے ہیں جو کاروباری اداروں اور تاجروں کو فون کرتے ہیں کہ "پولیس کی امداد کے فنڈ کے لیے" عطیات درکار ہیں۔ اور تاجر حضرات لاکھوں ڈالر ان کی نذر کر دیتے ہیں اور یہ دریافت کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ آیا فون کرنے والا درحقیقت پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتا ہے یا کوئی "پیشہ ور" چندہ جمع کرنے والا ہے۔ جب ٹی وی کے نمائندے نے عطیات دینے والوں سے انٹرویوز لیے تو انھوں نے بتایا کہ بے شمار لوگ سال میں دو دو تین تین مرتبہ چندہ دے چکے ہیں۔ پوچھا گیا "مگر آپ یہ رقم کیوں دیتے ہیں؟" عام طور پر سب کا جواب یہ تھا۔ "پولیس کی عداوت سے بچنے کے لیے" محکمہ پولیس کے ایک ترجمان نے بتایا کہ یہ رقوم جو لوگ پولیس کے نام پر دیتے ہیں پولیس تک نہیں پہنچتیں۔ البتہ پولیس کی طرف سے گاہے گاہے "پولیس فنڈ" کے سلسلے میں چندے کی اپیلیں ضرور ہوتی ہیں اور ورائٹی کے پروگرام بھی مرتب کیے جاتے ہیں جن میں بڑے بڑے فن کار "بطور امداد" حصہ لیتے ہیں۔ ترجمان نے کہا کہ جو لوگ پولیس فنڈ میں چندہ دیتے ہیں ان کو پولیس کوئی خاص مراعات نہیں دیتی۔ مگر ٹی وی کے نمائندے کا تاثر اس کے برعکس تھا۔

پاکستان میں ٹی وی کی مقبول ترین اور مشہور ترین شخصیت کیا مشاہرہ لیتی ہے چھوڑیئے اس جھگڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سنیئے کہ امریکہ میں ٹی وی کی

مقبول ہستی کا معاوضہ کیا ہے؟

باربرا والٹرز کو امریکی ٹی وی میں بہترین نیوز کاسٹر کا مقام حاصل ہے وہ مشہور شخصیتوں سے انٹرویو لینے کے لیے شہرت رکھتی ہیں اور اس کام میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے مگر کیا آپ یقین کریں گے کہ امریکہ کی تین سب سے بڑی ٹیلی ویژن کمپنیاں ان کی خدمات حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ بولی لگا رہی ہیں۔ اے بی سی کے ساتھ ان کا معاہدہ ستمبر میں ختم ہونے والا ہے اور کئی کمپنیاں انھیں دس لاکھ ڈالر سالانہ معاوضہ پیش کرنے کو تیار ہیں اس کے علاوہ دوسری سہولتوں کی بھی پیش کش کی جا رہی ہے۔

باربرا والٹرز مشہور زمانہ سیاسی اور سماجی ہستیوں کے انٹرویوز لینے کے لیے مشہور ہیں۔ پچھلے دنوں ان کا پروگرام باربرا والٹرز اسپیشل ٹی وی سے پیش کیا گیا تو لوگ سارے پروگرام چھوڑ کر ان کا پروگرام دیکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ اس پروگرام میں انھوں نے تین خواتین سے انٹرویو لیا۔ پہلی مشہور اداکارہ کیتھرین ہیپ برن، دوسری اداکارہ لورین بکال اور تیسری صدر امریکہ کی بیگم مسز نینسی ریگن۔ اس لحاظ سے تینوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ مسز نینسی ریگن بھی اداکارہ رہ چکی ہیں اور ۲۹ سال قبل مسٹر ریگن سے شادی کرنے کے بعد گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنے کی غرض سے انھوں نے اداکاری کو خیرباد کہہ دیا تھا اور پھر کبھی اسکرین کا رُخ نہ کیا۔ جبکہ ان کے شوہر بدستور فلموں میں کام کرتے رہے۔

یہ پروگرام کوئی ایسا "توپ" تو نہ تھا کہ جس کا اتنا شہرہ تھا لیکن خصوصیت یہ تھی کہ باربرا والٹرز نے بڑی بے تکلفی سے سوالات کیے۔ ان کا ایک خاص انداز یہ ہے کہ اچانک کوئی چبھتا ہوا سوال کر ڈالتی ہیں۔

کیتھرین ہیپ برن نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ وہ خدا پر بالکل یقین

نہیں رکھتیں پوچھا گیا پھر آخرت یا دوسری دُنیا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیتھرین ہیپ برن مسکرائیں اور بولیں "محض کہانیاں ہیں"۔

کیتھرین ہیپ برن ۶۰ سال سے زائد عمر کی ہو چکی ہیں آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہو چکی ہے مگر گرج دار آواز ہے۔ ایک اور بات انھوں نے یہ کہی کہ عورت کا صحیح مقام گھر ہے۔ وہ کام اور نوکری کے لیے گھر سے باہر نکلتی ہے تو گھریلو زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر دوبارہ موقع ملے تو مَیں اپنی زندگی بالکل اِسی طرح بسر کردوں جس طرح مَیں نے بسر کی ہے۔ اِس لیے کہ اداکاری کو مَیں نے پیشہ سمجھ کر نہیں اختیار کیا بلکہ یہ میرا شوق تھا۔ لورین بکال بھی اپنے زمانے کی مشہور اداکارہ ہیں۔ انھوں نے نوکری اور کام کاج کے بارے میں کیتھرین ہیپ برن کی رائے سے اختلاف کیا لیکن وہ خدا پر بھی یقین رکھتی ہیں۔ انھوں نے چند مشہور ہستیوں کے بارے میں اپنے تاثرات بھی بیان کیے۔

مگر میرے خیال میں سب سے زیادہ موثر اور اچھا اِنٹرویو خاتون اول مسز نینسی ریگن کا تھا۔ انٹرویو شروع ہونے سے پہلے باربرا نے وہائٹ ہاؤس کی چند جھلکیاں دکھائیں اور پھر مسز نینسی سے انٹرویو ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسز ریگن کی شخصیت میں بے انتہا کشش اور رکھ رکھاؤ ہے۔ اِن کے خیالات میں گہرائی ہے اور بات کرنے کا انداز نہایت سادہ لیکن پُراثر اور دل نشیں ہے۔ خاص طور پر جب انھوں نے صدر ریگن پر قاتلانہ حملے اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر کیا تو آبدیدہ ہو گئیں۔ اس وقت وہ ایک خالص گھریلو بیوی نظر آ رہی تھیں۔

باربرا والٹرز کو یہ بھاری معاوضہ اور سہولتیں کس کام کے عوض پیش کی جا رہی ہیں۔

سال میں چار انٹرویوز حاصل کرنے کے معاوضے میں لطف کی بات یہ ہے کہ جب باربرا شروع میں ٹی وی پر آئیں تو بہت نروس ہوا کرتی تھیں یہاں تک کہ بعض تجربہ کار

نیوز کاسٹروں نے ان کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب —! وہ امریکہ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی نیوز کاسٹر اور ٹی وی کی مقبول ترین ہستی ہیں۔

اداکارہ الزبیتھ ٹیلر کے نام سے دُنیا میں کوئی واقف نہیں ہے انھوں نے چند سال قبل سینیٹر جان وارنر سے شادی کر لی تھی اور ہمارے آس پاس ریاست ورجینیا ہی میں رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں پچھلے دنوں ایک بار پھر یہ افواہ اُڑی تھی کہ ان کی اپنے موجودہ شوہر سے بھی علیحدگی ہونے والی ہے مگر لوگوں نے اس کی پُرزور تردید کر دی۔ اگرچہ ایسی تردیدوں کی اہمیت بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ بہرحال الزبیتھ ٹیلر نے اپنے شوہر کو انتخابات میں کامیاب کرانے کے سلسلے میں بہت محنت کی اور وہ سینیٹر منتخب ہو گئے۔ وہ صدر ریگن کے حامیوں میں سے بھی تھیں چنانچہ ریگن کے صدر منتخب ہونے کے بعد الزبیتھ ٹیلر نے اس خوشی میں اپنے گھر پر ایک دعوت منعقد کی اور زمانے بھر کے اداکاروں کو اکٹھا کر لیا۔

ان گھریلو مصروفیات کے ساتھ ساتھ وہ چُپکے چُپکے اداکاری کے شوق کی بھی پرورش کرتی رہیں چند ماہ قبل انھوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے کی پیش کش کی۔ نقادوں نے ان کو زیادہ نہیں سراہا مگر ان کے شوہر نے کہا کہ لزنے تو کمال کر دیا ہے۔ اس کی اصل صلاحیتیں تو اب ظاہر ہو رہی ہیں۔ گزشتہ دنوں الزبیتھ ٹیلر نے ایک ڈرامے "دی لٹل فاکس" (THE LITTLE FOX) میں مرکزی کردار ادا کیا اور خوب داد حاصل کی۔ ۴۹ سال کی عمر میں اب وہ پہلے سے زیادہ موٹی ہو گئی ہیں مگر چہرے کی دلکشی برقرار ہے اور پھر الزبیتھ ٹیلر کے نام اور شخصیت کا سحر بھی قائم ہے۔ لوگ ڈرامہ دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ مگر چند دن بعد ہی ڈرامہ ملتوی کر دیا گیا۔ وجہ؟ الزبیتھ ٹیلر کی شدید علالت، وہ ہسپتال میں داخل ہو گئیں اور فلم ساز کو لاکھوں ڈالر روزانہ کا نقصان اٹھانا پڑا مگر فلم ساز سے زیادہ اصل نقصان تو انشورنس کمپنیوں کو ہوا جنھوں نے لاکھوں

ڈالر کے عوض اس ڈرامے کا بیمہ کیا تھا۔

یہ پہلی بار نہیں ہے کہ الزبیتھ ٹیلر شدید بیمار ہو کر ہسپتال پہنچی ہیں۔ ان کے بارے میں فلمی دُنیا میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ بلّی کی طرح ان کی بھی درجنوں زندگیاں ہیں وہ بار بار بیمار ہوتیں۔ اکثر فلموں کی تیاری کے دوران میں، اور فلم سازوں کو بھاری نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ "کلوپٹرا" کی تیاری کے دوران میں تو کئی انشورنس کمپنیاں دیوالیہ ہو گئی تھیں اور یاد رکھیئے ان کی بیماری کوئی نخرہ یا بہانہ نہیں ہوتی۔ کئی بار وہ موت کے منہ سے بال بال بچ گئیں، اب ذرا ان کی بیماریوں کی فہرست اور نوعیت ملاحظہ فرمایئے اور اس عورت کی قیمت اور برداشت کی داد دیجئے جو ۴۹ سال کی عمر میں بھی بدستور اداکاری کا مظاہرہ کرنے پر تُلی ہوتی ہے۔

طلاقیں اور بچّے

مغرب میں طلاقوں کا اوسط بڑھتا جا رہا ہے اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر یہ سب کتابیں بڑے آدمیوں نے لکھی ہیں لیکن اب بچّوں نے بھی اِس موضوع پر ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں طلاق کے بارے میں بچّوں کے نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بچّوں نے لکھی ہے اور بچّوں کے لیے لکھی ہے۔ ۱۲۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ جب میاں اور بیوی میں طلاق ہوتی ہے تو سب سے زیادہ تباہی، بربادی اور شامت بچوں کی آتی ہے۔

ہُوا یوں کہ نیویارک کے ابتدائی اسکول کے ٹیچر ایرک ووڈمن نے ایک دن غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی کلاس کے بیس بچوں میں سے ۱۴ بچّے ایسے ہیں جن کے ماں باپ طلاق کے بعد علیٰحدہ ہو چکے ہیں چنانچہ اس نے اِس موضوع پر بچّوں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا اور اس سلسلے میں جو کتابیں اب تک لکھی جا چکی ہیں۔ ان کے حوالے سے بچّوں کے ساتھ گفتگو کی۔ مگر بچّوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ وہ سب کتابیں بڑی عمر کے لوگوں نے لکھی ہیں جن میں بچّوں کا نقطہ نظر پیش نہیں کیا گیا ہے، چنانچہ ایرک نے فیصلہ کیا کہ تمام بچّے مل کر ایک کتاب لکھیں۔ کتاب کا نام ہے "طلاق کے بارے میں بچّوں کی کتاب" (THE KIDS' BOOK OF DIVORCE) بچّوں نے لکھا ہے کہ

میاں بیوی طلاق کے بعد الگ الگ دُنیا بسا لیتے ہیں مگر بچے محرومی اور بے مکانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انھیں ماں اور باپ دونوں سے محبت ہوتی ہے مگر دونوں میں مقدمہ بازی ہو رہی ہے کہ بچے کس کی تحویل میں رہیں۔ اب بتایئے بچہ کس کی طرفداری کرے؟ طلاق کے بعد دونوں فریق الگ الگ بچّوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ اپنی ماں یا باپ کے ساتھ خوش ہیں؟ اب اگر بچہ غریب اپنا خیال ظاہر کرے تو اس بیان کو عدالت میں شہادت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ کتاب دانشمندانہ باتوں سے بھری ہوتی ہے حالانکہ اس کے بیس مصنّف ہیں جن کی عمریں گیارہ سے چودہ سال تک کی ہیں۔ کتاب میں بچّوں کو مشورے دیئے گئے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے مثلاً سوتیلے والدین کے ساتھ وہ کیا سلوک کریں؟ جو ماں باپ محض ہفتے کے ہفتے ان سے ملاقات کرنے آتے ہیں ان سے کس طرح پیش آئیں؟ ایک مشورہ یہ بھی ہے کہ والدین کی طلاق کے بارے جو ایگریمنٹ طے پائے بچّوں کو وہ ضرور پڑھنا چاہیئے اور ان کی منظوری کے بغیر اسے قانونی شکل نہ دی جائے۔

جب کتاب لکھنے کی خبر عام ہوئی تو بہت سے والدین نے اس تجویز پر اعتراض کیا مگر اس کے باوجود کتاب نہ صرف لکھی گئی بلکہ شائع بھی ہو گئی اور اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے اقتباسات بڑے بڑے اخباروں میں شائع کیے گئے۔ اور اب تک اس کے چار ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔ رائلٹی کی بھاری رقم کے بائیس حصّے کیے گئے ہیں۔ بیس حصّے ہر بچّے کے لیے (جو مصنّف ہے) ایک حصّہ اسکول کے فنڈ کے لیے اور ایک حصّہ ان کے استاد اور کتاب کے ایڈیٹر ایرک کے لیے۔ بچّوں نے دو دو اور تین تین کی ٹولیوں میں بٹ کر کتاب کے دس باب لکھے ہیں جن کی زبان کی درستگی ایرک نے کی ہے۔ کتاب میں بچّوں نے اپنے تجربات بھی لکھے ہیں مثلاً ایک بارہ سالہ بچّی نے لکھا ہے۔

میرے ماں باپ طلاق کے بعد الگ رہنے لگے۔ ایک دن ڈیڈی نے مجھے نیکر دلایا جب میں وہ پہن کر ممی کے پاس گئی تو انھوں نے ایک اس سے بھی زیادہ قیمتی نیکر مجھے دلا دیا۔ میں ڈیڈی کے پاس واپس گئی تو وہ فوراً مجھے لے کر بازار گئے اور مجھے بہت خوبصورت جوتے دلا دیئے۔ بس پھر کیا تھا ممی اور ڈیڈی میں مقابلہ شروع ہو گیا اور چند دن کے اندر میرے پاس جوتوں اور نیکروں کا ڈھیر لگ گیا۔ مجھے یہ سب چیزیں پسند آئیں مگر یہ سوچ کر مجھے نفرت ہونے لگتی ہے کہ ممی اور ڈیڈی یہ سب کچھ میری محبت کی خاطر نہیں بلکہ ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے کر رہے ہیں۔

کتاب میں بچّوں کے ساتھ ساتھ والدین کو بھی مفید مشورے دیئے گئے ہیں مثلاً والدین سے کہا گیا ہے کہ میاں بیوی جیسے ہی طلاق کا فیصلہ کریں انھیں چاہیئے کہ بچّوں کو فوراً بتا دیں۔ بتانے کا طریقہ یہ ہو کہ ماں اور باپ دونوں بیک وقت بچّوں کو مطلع کریں۔ مصنّفین کا کہنا ہے کہ ماں باپ بہت عرصہ تک طلاق کی بات بچّوں سے چھپاتے رہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں اِس لیے کہ ایک نہ ایک دن تو یہ حقیقت سامنے آ ہی جائے گی۔

اِس کتاب میں بچّوں کی ذہنی سماجی اور نفسیاتی مشکلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سے نقّادوں اور ماہرین نے کتاب کے مصنّفین سے انٹرویو لیے اور خیال ہے کہ یہ کتاب فروخت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کرے گی۔

اِن دنوں کینیڈا میں اسکول اور یونیورسٹیاں کُھل رہی ہیں اور داخلے شروع ہیں ان مناظر کو دیکھ کر اپنا ملک بہت یاد آتا ہے۔ اِس لیے کہ یہاں تعلیم کی سہولتیں بہت زیادہ ہیں۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہے جو والدین اسکول جانے کی عمر کے بچّے کو اسکول نہیں بھیجتے قانون انھیں سزا دیتا ہے۔ بہت اچھے اسکول ہیں جن کے دروازے رنگ و نسل کی تمیز کے بغیر ہر ایک کے لیے کُھلے ہوتے ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں میں یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم اور داخلہ بہت بڑا مسئلہ ہے، یہاں معاملہ برعکس ہے۔ مثال کے طور پر صرف صوبہ اونٹاریو میں پندرہ یونیورسٹیاں ہیں۔ حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ جو طلبہ ۶۰ فیصد نمبر حاصل کریں وہ یونیورسٹی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہاں یونیورسٹیوں کی تعلیم پر ایک تو خرچ بہت ہوتا ہے دوسرے ضروری ہے کہ طالب علم اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہو، یہ نہیں کہ نالائق طلبہ سے یونیورسٹیوں کو بھر دیا جائے اور قابل طلبہ کے لیے جگہ ہی نہ رہے۔ پھر اعلیٰ تعلیم بھی ایک نظم اور منصوبے کے تحت حاصل کی جاتی ہے۔

پچھلے دنوں ٹورنٹو کی بعض یونیورسٹیوں نے طلبہ کے داخلے کے معیار کو بلند کر کے ۵ء۴ فیصد نمبر اور بعض یونیورسٹیوں میں ۶۵ فیصد نمبر کر دیا ہے اس کے باوجود داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طلبہ محنت اور لگن سے پڑھتے ہیں اور اونچے نمبر حاصل کرتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں داخلے کا معیار بلند کرنے کا مقصد تعلیم کے معیار کو مزید بلند کرنا ہے مگر ہمارے ہاں بدقسمتی سے اب بھی سفارش چلتی ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے بہت کم طلبہ ایسے ہوتے ہیں جو معیار پر پورے اُترتے ہیں یا معیاری تعلیم حاصل کر کے معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

جنسی آزادی، ہم جنسی کی آزادی اور اب بچّوں کے لیے جنسی آزادی، یہ آزاد معاشرہ جنسی آزادی کی راہ پر نہایت تیز رفتاری سے رواں دواں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی جگہ بھی یہ سلسلہ رُکنے کا نام نہیں لے گا۔ ایک گزشتہ مضمون میں واشنگٹن کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ وہاں سولہ سال کی عمر کے بچّوں کو باہمی رضامندی سے جنسی رشتہ قائم کرنے کی آزادی دلانے کے لیے قانون سازی کی جا رہی ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں کچھ عرصے سے بچّوں کو جنسی آزادی دلانے کے لیے بہت زور دیا جا رہا ہے

اور لُطف کی بات یہ ہے کہ بچّوں نے اس کا مطالبہ خود نہیں کیا ان کے لیے یہ سب آزادیاں طلب کرنے والے بالغ لوگ ہیں۔ پہلے تو یہ تجویز تھی کہ بچّوں کو باہمی رضامندی سے جنسی رشتے قائم کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ مگر اب یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ کم عمر بچّوں اور بڑوں کے مابین بھی قانون ایسے روابط کی اجازت دے دے۔ ایک ماہرِ نفسیات نے لکھا ہے کہ :-

ہماری قوم کے بچّے اپنے کھیل کود اور دلچسپیوں میں مصروف ہیں مگر بالغ لوگ جان بُوجھ کر ان کے اندر جنسی بیداری پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ذہن کو اس طرف مبذول کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان ممالک میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو اُن بے ہودہ آزادیوں کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے مگر ان کی آواز نقّارخانے میں طوطی کی طرح بے آواز اور بے اثر ہے۔ پے در پے ایسے قوانین بنائے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے اخلاق اور معاشرے کی تمام پچھلی روایات پامال ہو گئی ہیں۔ تقریباً ہر قسم کے جنسی رشتوں کو قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ اور اب آخری کوشش یہ ہے کہ باقی ماندہ چند پابندیاں بھی دُور کر دی جائیں جس کے بعد یہ صحیح معنوں میں "مادر پدر آزاد" معاشرہ آزاد ہو جائے گا۔ ٹورنٹو اسٹار کی خاتون صحافی نے اس منصوبے پر ایک کالم لکھا ہے جس کے آخر میں نہایت دردمندی سے لکھا ہے کہ خدا کے لیے کم از کم بچّوں سے ان کی معصومیت تو نہ چھینیے۔

اِدھر اُدھر کی

ہاورڈ ہیوز امریکہ کے ایک ارب پتی تھے وہ جہاز ساز تھے۔ کئی تجارتی کمپنیوں اور ہوٹلوں کے مالک تھے۔ فلم کمپنیوں، ریڈیو اور ٹی وی کمپنیوں کے مالک تھے۔ خود بھی ہوا باز تھے اور انھوں نے کئی عالمی ریکارڈ قائم کیے تھے۔ دُنیا کی حسین ترین عورتوں کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا رہا۔ تقریباً چار سال قبل جب ان کا ہوائی سفر کے دوران انتقال ہوا تو پتہ چلا کہ انھوں نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی ہے جس کی رُو سے ان کی اربوں ڈالر کی وراثت کا فیصلہ کیا جاسکے۔

ان کے مرنے کے بعد تقریباً چھ سو دعویدار پیدا ہوگئے ہیں جو اُن کے ساتھ اپنا جائز اور ناجائز رشتہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مقدمہ گزشتہ چار سال سے زیرِ سماعت ہے۔ درجنوں وکیل دعویداروں کی طرف سے عدالت کو اپنے موکّل یا موکّلہ کے حقوق کا یقین دلانے کے دلائل پیش کر رہے ہیں۔

ہاورڈ ہیوز کی زندگی پراسراریت اور ڈرامہ کا امتزاج تھی اُن کی موت بھی ایسی ہی ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں وہ اپنے ذاتی ہوائی جہاز میں میکسیکو سے ہیوسٹن جا رہے تھے کہ مرگئے ان کی عمر ۷۰ سال تھی اور وہ کافی عرصے سے نفسیاتی، ذہنی اور جسمانی عوارض کا شکار تھے۔

انھوں نے وصیت کے مطابق کوئی وارث نہیں چھوڑا ان کی جائیداد کی مالیت کا اندازہ قرضوں کی ادائیگی کے بعد ایک ارب بیس کروڑ ڈالر سے زیادہ لگایا گیا ہے لطف کی بات یہ ہے کہ وراثت کے دعوے داروں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ ثابت کرنے میں مصروف ہیں کہ وہ ہاورڈ ہیوز کی ناجائز اولاد ہے بعض لوگ اپنی شباہت کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ کوئی دادا پردادا کی طرف سے خونی رشتہ کا دعویدار ہیں۔ خیال ہے کہ مقدمہ اپنی پیچیدگیوں کی وجہ سے کافی عرصہ زیرِ سماعت رہے گا اور اس کے بعد جن لوگوں کے حق میں فیصلہ ہوگا وہ حکومت کے ٹیکس اور وکیلوں کی فیسیں ادا کرنے کے بعد شاید کچھ بھی حاصل نہ کرسکیں۔

ہالی وُڈ جو ساری دُنیا تے فلم کا مرکزی شہر ہے۔ اِن دنوں نشہ بازوں کی جنت کا شہر بن گیا ہے کہا جاتا ہے کہ مختلف قسم کے نشے ہالی وُڈ میں اس کثرت سے کیے جا رہے ہیں کہ یہ علّت ناقابلِ علاج ہوگئی ہے۔ ہالی وُڈ کے بیشتر بڑے، بڑے فلم ساز اداکار، موسیقار اور مصنّف بھی اِس کا شکار ہیں اور یہ وبا کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ پچھلے دنوں وفاقی حکومت نے ایک تحقیقی کمیشن قائم کیا تھا جس نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ہر قسم کی نشہ بازی ہالی وُڈ میں ناقابلِ اصلاح حد تک پہنچ چکی ہے۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران ہالی وُڈ کے کئی ممتاز اسٹار اس جُرم میں پکڑے بھی جاچکے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے علاج کے لیے خصوصی طبّی مراکز کا رُخ کیا ہے جہاں بھاری فیسیں وصول کی جاتی ہیں لیکن جب تک مریض خود قوّتِ ارادی سے کام نہ لے اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

ورجینا کا ایک معذور شخص چارلس کو حکومت سے ناراض ہے اور وہ حکومت پر دو کروڑ ڈالر ہرجانے کا مقدمہ دائر کر رہا ہے . . . سبب ؟

چارلس صاحب سڑک پر اپنی وہیل چیئر لیے جا رہے تھے کہ ٹریفک کے ایک سپاہی نے ان کا چالان کردیا اور انھیں ٹکٹ دے دیا۔ چارلس کا کہنا ہے کہ یہ حماقت کی انتہا ہے

اِس لیے کہ سڑک پر وہیل چیئر چلانے کے لیے کوئی علیٰحدہ جگہ نہیں ہے پھر میں اپنی وہیل کہاں چلاؤں ؟ ۴۵ سالہ چارلس پندرہ سال پہلے معذور ہوگیا تھا جب کہ ایک ٹرک نے اسے کچل دیا تھا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ چارلس اسی سڑک پر حادثے کا شکار ہُوا تھا جس پر وہیل چیئر چلانے کے الزام میں اس کا چالان کیا گیا ہے۔ چارلس کا کہنا ہے کہ حکومت کو ہر سڑک پر معذوروں کے لیے علیٰحدہ راستے بنانے چاہئیں۔ امریکی معذوروں کی انجمن نے چارلس کے ساتھ تعاون کیا ہے، مگر پولیس کا کہنا ہے کہ چارلس سڑک پر وہیل چیئر چلاتا ہے جس کی وجہ سے تیز رفتار کار ڈرائیوروں کو مشکل ہوتی ہے۔ دیکھئے یہ مقدمہ کون جیتتا ہے ؟

کیا اِس صدی میں عرب مغربی یورپ پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیں گے ؟

یہ پیشنگوئی سولہویں صدی عیسوی میں ایک فرانسیسی ماہرِ طب اور نجومی نے کی تھی جن کا نام مچل ڈی ناسٹرڈیم تھا۔ پیرس میں حال ہی میں ایک مورخ جین چارلس نے ۱۲ سال کی تحقیق کے بعد ایک کتاب شائع کی ہے جس میں دعویٰ کیا ہے کہ آج سے چار سو ۲۶ سال پہلے مچل ڈی ناسٹرڈیم نے جو پیش گوئیاں کی تھیں کہ ان میں بہت سے حرف بحرف دُرست ثابت ہو چکی ہیں، مثال کے طور پر ناسٹرڈیم نے پیش گوئی کی تھی کہ ۱۵۵۵ء میں شاہ ہنری اچانک مرجائے گا، ۱۷۸۹ء میں فرانس میں انقلاب آجائے گا۔ ۱۷۹۳ء میں شاہ لوئی پیرس سے فرار ہوجائے گا مگر اسے قتل کردیا جائے گا، ۱۸۰۰ء میں نپولین کے عروج کی پیش گوئی بھی کی گئی تھی کہ ۱۹۳۰ء میں اٹلی، جرمنی اور اسپین میں فوجی آمر برسرِ اقتدار آجائیں گے۔ (مسولینی، ہٹلر اور فرانکو نے اس کو درست ثابت کردیا) ناسٹرڈیم نے پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے بارے میں بھی پیش گوئی کی۔ یہاں تک کہ اس نے کہا تھا کہ ۱۹۷۹ء میں شہنشاہِ ایران معزول ہوجائیں گے اور ۱۹۸۱ء میں فرانس میں بائیں بازو والے برسرِ اقتدار آجائیں گے۔ شاہ ایران کے بارے میں ناسٹرڈیم نے سوا چار سو سال پہلے جو پیش گوئی کی

تھی اس کے الفاظ یہ ہیں۔

فارس (ایران) قحط، جنگ اور انقلاب کا نشانہ بنے گا۔ مذہبی قسم کے لوگ شاہِ ایران سے دغا کریں گے جس کا آغاز گال (کانفرنس) سے ہوگا اس انقلاب کا داعی ایک مذہبی پیشوا ہوگا جو فرانس کے ایک دُور دراز علاقے سے آئے گا۔

کتاب کے مصنف کا کہنا ہے یہ دُور دراز علاقہ فرانس میں وہ جگہ ہے جہاں سے آیت اللہ خمینی نے انقلابِ ایران کی قیادت کی۔ اِس کتاب کی اشاعت نے یورپ اور خصوصاً فرانس میں ہلچل مچادی ہے۔ ناسٹرڈیم نے یہ پیش گوئیاں قدیم فرانسیسی زبان میں تحریر کی تھیں جن کا پہلے لاطینی میں ترجمہ کیا گیا اور بعد میں انھیں جدید فرانسیسی زبان میں منتقل کیا گیا تاکہ ناسٹرڈیم کا مفہوم واضح ہوجائے جو گزر چکا ہے اس کی تو چھوڑیئے مگر پریشانی کی بات یہ ہے کہ ناسٹرڈیم صاحب نے آنے والے زمانے کے لیے جو پیش گوئیاں کی ہیں وہ نہایت "روح فرسا" ہیں مثلاً ان کی چند پیش گوئیاں یہ ہیں :-

آئندہ پانچ سال کے اندر مشرق وسطیٰ میں جنگ چھڑ جائے گی جس میں بڑی طاقتیں بھی ملوث ہوجائیں گی۔ اِس جنگ کے آغاز سے پہلے برطانیہ اور فرانس میں انقلابی سرگرمیاں شروع ہوجائیں گی پولینڈ میں مذہب کے نام پر گڑبڑ ہوگی۔

مغربی جرمنی پر حملہ ہوگا اور روسی اور عرب افواج اٹلی اور فرانس پر حملہ کردیں گی۔ یہ جنگ تین سال سات ماہ جاری رہے گی۔ مغربی یورپ روس کے قبضے میں آجائے گا اور دو سال تک روس کا قبضہ جاری رہے گا۔ اِس جنگ کے خاتمے پر پیرس بالکل تباہ ہوجائے گا اور سال کے بعد فرانس اور اسپین کی افواج امریکہ کے تعاون سے حملہ آوروں کو مار بھگائیں گے اور فرانس میں دوبارہ بادشاہت قائم ہوجائے گی۔ اس جنگ کے دوران سوئٹزرلینڈ میں شدید قحط پڑے گا۔ فرانس اور اٹلی کے بیشتر ساحلی علاقوں میں زلزلے آئیں گے۔ اس تیسری جنگ عالمگیر کے بعد کچھ عرصہ امن و امان رہے

گا مگر پھر ۱۹۹۹ء میں چین کے ساتھ مغربی طاقتوں کی بہت خطرناک جنگ ہوگی ناسٹرڈیم نے اس کا انجام نہیں بتایا مگر لکھا ہے کہ اس جنگ کے بعد دُنیا میں خوشحالی اور امن کا دَور شروع ہوگا۔

کینیڈا کے موجودہ وزیراعظم کی سابق بیگم مارگریٹ ٹرڈڈو (جو ابھی تک اپنے شوہر کا نام ٹرڈڈو استعمال کرتی ہیں) اپنے شوہر کے لیے ایک مستقل مسئلہ بنی ہوتی ہیں جب مارگریٹ ٹرڈڈو نے مسٹر ٹرڈڈو سے شادی کی تھی اس وقت وہ ایک صحافی تھیں اور اپنے شوہر سے بیس بائیس سال کم عمر تھیں مگر دونوں "محبت" میں مبتلا ہوگئے۔ مسٹر ٹرڈڈو جو "بدنام کنوارے" تھے بالآخر ازدواجی بندھن میں گرفتار ہوگئے اور انھوں نے مارگریٹ سے شادی کر لی۔

دو بچّوں کی پیدائش کے باوجود ان دونوں کے تعلقات خراب ہوتے چلے گئے مارگریٹ جو آزاد زندگی گزارنے کی عادی تھیں۔ شادی کے بعد بھی آزادی سے گھومتی پھرتی اور مردوں سے دوستیاں کرتی تھیں۔ اور اخبار والے ہر روز ایک نیا سکینڈل بناتے تھے ٹرڈڈو صاحب مصلحت یا محبت کے ہاتھوں مجبور تھے اور ساری زیادتیاں برداشت کرتے تھے۔ کئی سال کی کشیدگی کے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی (طلاق نہیں) اور مارگریٹ نے کھلے عام اسکینڈل کرنا اور مردوں کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ مارگریٹ نے ایک کتاب بھی لکھی جس میں اپنی ذات اور اپنی حرکتوں کے بارے میں صاف صاف لگی لپٹی کے بغیر تمام معاشقے بیان کر دیئے۔ ان کے معاشقے کا چرچا تو دُنیا بھر میں ہوگیا تھا جب وہ کھلے بندوں میں ایک شخص کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ انھوں نے صحافت اختیار کی۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی پھر وہ اداکاری کی طرف راغب ہوئیں مگر ان کی فلم ناکام رہی اور نقادوں کے مطابق وہ تیسرے درجے کی اداکارہ ثابت ہوئیں مگر مارگریٹ کے رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا وہ "جیو اور جینے دو" کی قائل ہیں اور اس طرح

جی رہی ہیں کہ دُنیا دیکھتی ہے اور ششدر رہے اور وہ شوہر کے سینے پر مونگ دل رہی ہیں۔ رہ گئے ٹرڈڈو صاحب، تو وہ اس موضوع پر بالکل چُپ ہیں مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ ابھی تک مارگریٹ سے محبّت کرتے ہیں اور اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔

کینیڈا کی بیشتر صنعتوں اور کاروبار میں امریکی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ کینیڈا کے ایک درجن سے زائد عظیم صنعتی اداروں کے زیادہ تر حصص امریکیوں کے پاس ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض کینیڈین ادارے بھی بہت وسعت اختیار کر گئے ہیں اور اب ان کی نظر امریکی مارکیٹ کی طرف ہے۔ چنانچہ پچھلے ایک سال میں کئی بڑے امریکی صنعتی اداروں کو کینیڈا والوں نے خرید لیا ہے یا اُن کے زیادہ تر حصص حاصل کر لیے ہیں جس کی وجہ سے امریکی صنعت کاروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے۔ پچھلے ماہ امریکہ کے ایک ممتاز تیل اور گیس کے ادارے کو خریدنے کے لیے کینیڈا کی ایک فرم نے بہت بڑی آفر کر دی تھی۔ کئی امریکی اداروں نے جواب میں اور اچھی آفر کی اور امریکی صنعت کاروں کو یہ فکر پیدا ہو گئی کہ کہیں اس مفید اور موثر کاروبار پر کینیڈا کا قبضہ نہ ہو جائے۔ کئی امریکی اداروں نے بڑھ چڑھ کر "کوناکو" کو خریدنے کے لیے بولی لگانی شروع کر دی تاکہ یہ ادارہ کینیڈا کی تحویل میں نہ آجائے۔ آخر کار کئی گُنا قیمت پر ایک امریکی ادارہ "ایکسون" اسے خریدنے میں کامیاب ہوگیا لیکن اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ کینیڈا کے سرمایہ دار اب امریکی مارکیٹ کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔

دوسری طرف کینیڈا والوں کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ مقامی صنعت کاری میں امریکی سرمایہ اور امریکی اثر بڑھتا جا رہا ہے لہٰذا کینیڈا کی حکومت بعض تجاویز پر غور کر رہی ہے جن کے مطابق کینیڈا کی صنعتوں میں بیرونی سرمایہ کاری کو محدود کر دیا جائے گا۔ امریکی صنعت کاروں اور امریکی حکومت کو اس تجویز پر بہت تشویش پیدا ہوگئی ہے

کینیڈا کی حکومت نے خاص طور پر تیل اور گیس کی صنعتوں میں امریکی حکومت نے یہ انتباہ کیا ہے کہ اگر اس قسم کی پابندی لگا تی گئی تو اس کا سب سے زیا دہ اثر کینیڈا پر ہی پڑے گا۔ کاروباری حلقوں کا خیال ہے کہ اس معاشی جنگ سے کینیڈا کو زیادہ نقصان ہوگا کینیڈا اور امریکہ کے وسائل اور معاشی استحکام میں بہت فرق ہے اور اس جنگ میں کینیڈا کی شکست یقینی ہے۔ اگر امریکی حکومت نے کاروباری پابندیاں لگانے کا فیصلہ کیا تو کینیڈا کی کئی صنعتوں پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ اور کینیڈا گھاٹے میں رہے گا۔ کینیڈا کے بنکوں اور صنعتوں میں بڑے پیمانے پر امریکی سرمایہ لگا ہوا ہے اور اگر امریکہ نے یہ واپس لیا تو کینیڈا کی معیشت پر اثر انداز ہوگا۔ کینیڈا سے بہت سی برآمدات پر امریکی حکومت نے محصول اور ٹیکس معاف کر رکھا ہے۔ اگر یہ سہولت واپس لے لی گئی تب بھی کینیڈا کو نقصان ہوگا۔ امریکی حکومت کینیڈا سے فولاد اور دوسری اشیاء کی درآمدات کم کر کے بھی کینیڈا کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ دراصل گزشتہ سالہا سال کے عرصہ میں امریکہ اور کینیڈا کے مابین صنعتی کاروباری اور سماجی اعتبار سے بہت ہم آہنگی رہی ہے مگر پچھلے دو سال سے کینیڈا کے وزیراعظم مسٹر ٹروڈو کی پالیسیوں کی وجہ سے اختلافات پیدا ہونے لگے ہیں اور اگر ان پر قابو نہیں پایا گیا تو دونوں ملکوں میں اختلاف اور نفرت کی ایک وسیع خلیج حائل ہو جاتے جس کا زیادہ نقصان کینیڈا کو ہوگا۔

پیڈرو منٹگمری ایک خاتون ہیں۔ وہ جس جگہ رہتی ہیں وہ انتہائی صاف شفاف ہے بالکل شیشے کی طرح بے داغ۔ باورچی خانہ جدید سہولتوں سے آراستہ ہے جس میں لیس کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ یہاں مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ خصوصی کھانے تیار کیے جاتے ہیں۔ کھانا اتنا مرغن اور لذیز ہوتا ہے کہ بقول پیڈرو اگر آپ کو دُبلا ہونے کا شوق ہے تو اس باورچی خانے میں پکا ہوا کھانا نہ کھائیں اس لیے کہ خود پیڈرو نے پچھلے چند ماہ میں چالیس پونڈ وزن کا اضافہ کیا ہے۔ اب آپ پوچھیں

گے کہ پیڈرو کون خاتون ہیں؟ تو سُنیئے ان کا اصلی نام ڈونڈا ہے۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے اور جس جگہ کا یہ بیان ہے وہ کسی دولت مند کی رہائش گاہ نہیں ہے ایک جیل ہے۔ ڈونڈا کو اس قید خانے کے قیدی پیار سے پیڈرو کہتے ہیں۔ پیڈرو اس قید خانے کی انچارج بھی ہے۔ باورچن بھی ہے اور صفائی کی ذمہ دار بھی ہے۔ قید خانہ کینیڈا میں گلمر کاؤنٹی میں واقع ہے یہاں کے قیدیوں کو انتہائی اعلیٰ درجے کی خوراک کھانے کو ملتی ہے۔ پیڈرو اس جیل خانے کی انچارج ہے مگر اس کے ساتھ پورا خاندان رہتا ہے یعنی اس کی ماں، بڑی بہن، بیٹا، بیٹی اور دو نواسے، پیڈرو اور اس کا خاندان چوبیس گھنٹے جیل کی چار دیواری میں رہتا ہے۔ سوائے اس وقت کے جب پیڈرو سودا سلف لینے بازار جاتی ہے۔ پیڈرو اس جیل میں اتنی خوش اور مطمئن ہے کہ کسی قیمت پر بھی اس جیل کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی۔ گویا بقول شاعر ؎

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

بے چارے شاعر نے طنزیہ پیرائے میں اور دُکھ بھرے انداز میں آرام کا تذکرہ کیا ہے مگر پیڈرو کو درحقیقت دُنیا کی ہر آسائش اس جیل میں حاصل ہے، پیڈرو پر ہی منحصر نہیں ہے اس جیل کے دوسرے قیدی بھی نہایت ہشاش بشاش اور مطمئن ہیں۔ ایک قیدی نے اخبار والوں کو بتایا کہ اگر جیل سے باہر گھر والوں کا خیال نہ ہو تو اسے جیل سے باہر کی زندگی کا خیال بھی نہیں آتا۔ رہائی تو دور کی بات ہے۔ پچھلے دنوں سپریم کورٹ کی ایک معائنہ ٹیم جیل دیکھنے آئی۔ تو انھیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ تمام صفائی اور عیش و آرام کے علاوہ جیل خانے میں قیدیوں کے بستروں پر پھولدار اور خوبصورت بیڈ شیٹس بھی موجود ہیں۔ جب انھوں نے اعتراض کیا تو پیڈرو نے کہا دیکھتے نا اگر چند ڈالر زیادہ ادا کرنے سے آپ ملیشیا کی بجائے پھولدار چادریں خرید سکتے ہیں تو مضائقہ کیا ہے۔ قیدی اس ماحول میں زیادہ خوش رہتے ہیں۔

اِس جیل خانے میں ناشتے اور کھانے کا باقاعدہ مینو تیار کیا جاتا ہے۔ ناشتہ نو اور دس بجے کے درمیان مِل جاتا ہے اِس لیے کہ قیدی رات کو دیر سے سونا پسند کرتے ہیں اور لازماً دیر سے اُٹھتے ہیں۔ ناشتے میں انڈے گوشت۔ سینڈوچ۔ ٹوسٹ دلیہ اور فرنچ ٹوسٹ دیتے جاتے ہیں۔ کافی اور چائے الگ ہے۔ ان حالات کی وجہ سے جیل کے قیدیوں نے کبھی فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ بہت سے تو جیل سے رُخصت ہونا ہی نہیں چاہتے۔ ہاں گزشتہ گیارہ سال میں صرف ایک بار "فرار" کا واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ اس طرح کہ پیڈرو نے چند قیدیوں کو جنھیں وہ "بواتز" کہتی ہے ٹیلی فون کرنے کے لیے جیل سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ انھوں نے باہر جاکر شراب پی اور نشے میں آکر ایک پولیس کی گاڑی پر قبضہ جمالیا اور واپس جیل آگئے۔ شیرف اس واقعہ پر بے حد ناراض تھا مگر پیڈرو کا خیال ہے کہ یہ ایک مزاحیہ اور بچگانہ حرکت تھی۔

پیڈرو اپنی جگہ حق بجانب ہے مگر عوام کا بہت بڑا طبقہ اس کے خلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عوام کے ٹیکسوں سے مجرموں کو عیش کرانا کہاں کا انصاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ معاشرہ جرائم سے پاک نہیں ہوسکتا۔ کہیے آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ٹی وی اور مذہب

امریکہ اور کینیڈا کے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن رات دن پروگرام نشر کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ بعض اسٹیشن چند گھنٹوں کے لیے خاموش ہوتے ہیں لیکن بیشتر اسٹیشن ۲۴ گھنٹے اپنے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ پروگرام خاص طور پر ٹی وی پروگرام بہت دلچسپ اور رنگا رنگ ہوتے ہیں لیکن اشتہاروں اور اشتہاری فلموں کی بھی بہتات ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے "نیلام گھر" کے انداز پر مختلف ٹی وی اسٹیشنوں سے مختلف قسم کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں اشیاء اور مصنوعات کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ کُتّوں اور بلّیوں کی خوراک سے لے کر کاروں اور ہوائی جہاز کمپنیوں تک ہر قسم کی مصنوعات کے اشتہار دیکھنے میں آتے ہیں انتہائی سیریس اور دلچسپ پروگراموں اور فلموں کے درمیان میں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اشتہارات پیش کیے جاتے ہیں اور تو اور خود پروگرام پیش کرنے والے صاحب یا انٹرویو لینے والے حضرت یا خاتون مخاطب کی بات کاٹ کر اچانک کہتی ہیں (یا کہتے ہیں) اب آپ ایک پیغام سُنیے۔ یا ہمارا پروگرام اِس پیغام کے بعد ملاحظہ کیجیے۔ شروع شروع میں تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے اہم اور نازک موقع پر یہ کس کا پیغام نازل ہوگیا ہے اور کیوں؟ مگر کچھ دن بعد پتہ چلا کہ یہ "پیغام" دراصل اشتہار ہے۔ یعنی اشتہار کو اشتہار بھی نہیں کہتے۔ "پیغام" کے نام سے پکارتے ہیں۔ پاکستان میں

دلچسپ پروگرام فلم یا میچ کے درمیان میں اگر سگریٹ والے کبھی اپنا اشتہار "سپر امپوز" بھی کر دیتے ہیں تو دیکھنے والے بہت بُرا بھلا کہتے ہیں مگر یہاں یہ معمول میں داخل ہے۔ ایک فلم کا انتہائی نازک سین شروع ہے کہ اچانک کسی اطلاع یا اعلان کے بغیر اشتہار شروع ہو جاتا ہے اور چند لمحے تک تو دیکھنے والے کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ اشتہار ہے۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ کہانی نے یہ کیا رُخ اختیار کر لیا ہے؟ کچھ اشتہار دکھانے کے بعد اعلان ہوتا ہے کہ اب اپنا پروگرام دوبارہ دیکھئے۔ ناظرین ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں اور پھر کہیں جا کر خدا خدا کر کے اصلی فلم یا پروگرام دیکھنے میں آتا ہے۔ پہلے پہلے تو ہم سخت بور ہوا کرتے تھے۔ اچھا خاصا لطف کرکرا ہو جاتا تھا مگر اب صبر کر لیا ہے۔ اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے۔ ہر پروگرام کو قسطوں میں بلکہ قیمے کی شکل میں دیکھنا ہی یہاں کی ریت ہے۔

"نیلام گھر" کی قسم کے جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ان میں ایک ایک شخص کو کار، دنیا کی سیاحت کا مفت ہوائی ٹکٹ، فرنیچر اور نقد روپیہ مل جانا تو عام بات ہے اور اس کے لیے سوالوں کے جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ چار اشخاص قرعہ اندازی کے ذریعے چُن لیے جاتے ہیں۔ وہ اسکرین پر آ کر اٹکل سے چند نمبر یا سوالوں کے جواب دیتے ہیں جن کے لیے کسی قابلیت کی قطعاً نہیں ہے۔ محض اتفاق کیجئے۔ خوش نصیب ہوتے تو بہت کچھ مل گیا ورنہ تھوڑا بہت انعام تو مل ہی جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد ذہنی آزمائش کے پروگرام بھی ہوتے ہیں اور نئی دلچسپیاں اور رنگینیاں ان پروگراموں میں پیش کی جاتی ہیں۔

امریکہ والے یوں تو ساری دُنیا، خصوصاً مسلمانوں کی مذہب پرستی پر اعتراض کرتے ہیں مگر خود اپنی حالت یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی کے کئی اسٹیشن ایسے ہیں جو محض مذہبی پروگرام نشر کرتے ہیں، دھواں دھار مذہبی تقاریر، مولویوں کی طرح پُر زور دلائل کی بھرمار، بائبل کی کہانیاں اور مذہبی نظمیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اِن پروگراموں کے درمیان بھی ہر قسم کے اشتہار اور نغمے وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ یہ لوگ ہر جگہ اور ہر موقع

پر مذہب کی تکرار نہیں کرتے۔ مذہبی پروگراموں کے لیے ایک اسٹیشن مخصوص ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ "مذہب" ان کی روزمرّہ زندگی میں ہم لوگوں سے کچھ کم حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی حال "گرجاؤں" کا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں "مسجدیں" بہت زیادہ ہیں۔ مگر صاحب امریکہ میں گرجاؤں کی تعداد ہماری مسجدوں سے کہیں زیادہ ہے۔ قدم قدم پر چرچ۔ ہر قسم کے چرچ اور پھر دولت مند چرچ۔ نہایت خوبصورت، جدید ترین انداز کے چرچ، آس پاس نہایت حسین سبزہ زار۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا گزارہ چندوں اور وقف کی جائیدادوں اور کاروبار پر ہے اور یہ تو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ قوم چندہ دینے میں "شیر" ہے سیاسی لیڈروں کو، مذہبی پیشواؤں کو، محتاجوں اور ضرورت مندوں کو یہاں تک کہ پسماندہ ملکوں اور ان کے بھوکوں، بیماروں اور ننگوں کو بھی گراں بہا رقم چندے میں دیتی ہے اِس لیے یہاں کے "گرجا" کی حالت ہماری مسجدوں کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہی حالت پادری حضرات کی ہے ان کی تحویل میں لاکھوں ڈالر رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں ٹیکساس کے ایک بڑے پادری صاحب کے بارے میں اخبار میں انکشاف کیا گیا کہ انھوں نے اپنی بچپن کی دوست کو نقد رقوم دیں اور فائدے پہنچائے جس کے نتیجے میں وہ تقریباً دس لاکھ ڈالر کی جائیداد کی مالک بن گئی ہیں متعلقہ چرچ کی طرف سے اس کی تردید بھی کی گئی ہے مگر اخبار والے اپنے بیان کی تصدیق میں ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ واللہ اعلم یہ کہاں تک درست ہے مگر اس سے آپ اتنا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "چرچوں" اور پادریوں کی مالی حالت کتنی مستحکم ہے۔

کل ہی کی بات ہے کہ مَیں نے ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھا۔ سب سے پہلے تو ایک صاحب نے تقریر کی کہ امریکہ اور کینیڈا میں "مرنے کے اخراجات" بہت زیادہ ہیں۔ چاہے کوئی صاحب حیثیت ہو یا نہ ہو۔ اس کی تجہیز و تکفین پر تقریباً (کم سے کم) تین ہزار ڈالر خرچ ہوتے ہیں اگر تابوت قیمتی بنوائیں اور پھول زیادہ خریدے جائیں تو اور

بھی خرچ بڑھ جاتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ یہاں مرنے کے بعد رشتہ داروں کی تمام ذمہ داریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ "مُردہ خانے" کو اطلاع کر دیتا ہے اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔ تدفین کرنے والے ادارے (جو بہت خوشحال اور ہر جگہ موجود ہیں) باقی تمام رسوم اور ذمہ داریاں خود ہی ادا کر دیتے ہیں۔ مُردے کو نہلانا دُھلانا، لباس پہنانا، تابوت میں ڈالنا، قبرستان پہنچانا، پادری سے دُعا کرانا۔ قبر پر پھُول چڑھانا یہ سارے فرائض (BURIAL HOUSE) کے سپرد ہیں۔ یہ اس کے لیے معقول رقوم وصول کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ "صنعت" یہاں بہت خوشحال ہے۔

چنانچہ مقرر نے اس موضوع پر روشنی ڈالی کہ "مرنے" کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور مرنے والے کے لواحقین پر بہت بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ اکثر کے تو لواحقین ہی نہیں ہوتے چنانچہ بوڑھوں اور بوڑھیوں کو یہ اخراجات خود ہی ادا کرنے ہوتے ہیں۔ جن کا بندوبست یہ بے چارے اپنی زندگی ہی میں کر لیتے ہیں۔ مقرر نے کہا کہ مردہ گھروں کی تجارت بہت نفع کماتی ہے۔ حکومت کو اور مذہبی اداروں کو چاہیئے کہ مرنے والوں کا بھی کچھ خیال کرے۔

ان کے بعد ایک صاحب نے ایک "مرنے والے" کی رسوم دکھائیں اور بتایا کہ کہاں کہاں بچت ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد ایک لڑکی کی تصویر دکھائی گئی جو "وہیل چیئر" پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صاحب پروگرام نے بتایا کہ یہ لڑکی سیلون میں رہا کرتی تھی اور ایک دن کھیل کے دوران کمر میں چوٹ آجانے کی وجہ سے ریڑھ کی ہڈی ایسی خراب ہوئی کہ یہ چلنے پھرنے، یہاں تک کہ ہاتھ پیر کو حرکت دینے تک سے معذور ہو گئی۔ یہ حادثہ چار سال پہلے پیش آیا تھا اور ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا تھا مگر پھر یسوع مسیح کی برکت سے یہ ٹھیک ہو گئی یہ سب کیسے ہوا خود اسی لڑکی سے سُنیئے۔

اب اسکرین پر ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ یہ سانولی سلونی لڑکی، جس کی عمر اس نے ۲۳ سال بتائی۔ انگریزی بالکل امریکی لہجے میں بول رہی تھی اور گفتگو کے دوران اس نے جس زور شور

سے مذہب کا پرچار کیا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی "پیشہ ور" ہی اتنی پُرزور تقریر اتنے دھواں دھار اور پیشہ ورانہ انداز میں کر سکتا ہے۔ بہرحال لڑکی نے بتایا کہ اسے کیوں کر چوٹ آئی تھی اور وہ کس طرح چار سال تک بالکل معذور رہی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا مگر اس نے مسیح سے لو لگائی اور ایک دن یسوع مسیح اس کے پاس آئے انھوں نے کہا کہ میں کل ساڑھے تین بجے دوبارہ تمھارے پاس آؤں گا۔ چنانچہ میں نے اپنے ماں باپ کو اور تین دوسرے رشتہ داروں کو اس بارے میں بتایا۔ انھوں نے میرا یقین نہیں کیا مگر مجھے یقین تھا کہ اگلے دن ساڑھے تین بجے خداوند مسیح ضرور آئیں گے۔ کمپیئر نے پوچھا "مسیح نے کونسا وقت بتایا تھا۔ مقامی وقت یا امریکی وقت کے مطابق؟"

لڑکی "ظاہر ہے مقامی وقت کے مطابق"۔

لہٰذا میں نے ایک ایک گھنٹہ مسیح کی یاد میں بے تابی سے گزارہ۔ دوسرے دن میرے ماں باپ اور تین دوست میرے کمرے میں آگئے اور ہم لوگ انتظار کرنے لگے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے مگر مجھے پُورا یقین تھا کہ میرے مسیح اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ چنانچہ ٹھیک ساڑھے تین بجے کمرہ روشنی سے بھر گیا جیسے کہ کئی سورج نکل آئے ہوں خوشبو پھیل گئی اور میں نے مسیح کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ میرے سارے جسم میں حرارت کی لہر دوڑ گئی پور پور میں زندگی کروٹ لینے لگی اور آہستہ آہستہ میرے معذور ہاتھ پیر ٹھیک ہو گئے۔

یہ داستان میں نے نہایت مختصر طور پر اپنے الفاظ میں بیان کی ہے میں وہ انداز پیدا نہیں کر سکتا۔ بہرحال اس بیان کے خاتمے پر کمپیئرز نے نہایت مسرت اور حیرت کا اظہار کیا اور "خاتون" نے کہا کہ جو شخص مسیح سے سچی لو لگاتے وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے اور پروگرام ختم ہو گیا۔ نہ تو یہ بتایا گیا کہ یہ لڑکی سیلون میں کس جگہ رہتی تھی، کس ہسپتال میں زیر علاج رہی۔ کن ڈاکٹروں نے جواب دیا تھا اور کن لوگوں نے اسے صحت مند ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں

سے دیکھا۔ مگر پروگرام کا ایک تاثر تھا۔ اور پھر لڑکی نے جس جوش و خروش سے تقریر کی اور "ایمان" کی قوت کا ذکر کیا وہ بے حد متاثر کن تھا۔

اِس قسم کے پروگرام رات دن ان مذہبی اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم لوگ ہر وقت اور ہر جگہ مذہب کا ذکر کرتے رہتے ہیں حالانکہ اس پر عمل نہیں کرتے اور ان لوگوں نے اس مقصد کے لیے بہت بڑی تعداد میں چرچ اور مذہبی ادارے قائم کر دیئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور تسلیم کرنا ہوگا ان کی تبلیغ نے ان کے مذہب کو وسعت اور مقبولیت بھی دی ہے۔

سیاحت اور جسم فروشی

معاشی اور اقتصادی طور پر پسماندہ ملکوں میں سیاحت کے نام پر فحاشی خصوصاً جسم فروشی اور عصمت فروشی تیزی سے پھیل رہی ہے۔

سیاحوں کی دلچسپی اور دلبستگی کے لیے مغربی ملکوں میں بھی جنس کو ایکسپلائٹ کیا جاتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مغرب میں جنس اور عصمت کا تصور ہی مشرق سے مختلف ہے۔ مغربی معاشرہ عورت کی آبرو اور عصمت کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا جب کہ مشرق میں لوگ اس کی خاطر جانیں نچھاور کر دیتے ہیں۔ بے شمار قتل اور خون ریز جھگڑے محض اس بنا پر ہوتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مغرب میں ایسی بے روزگاری اور غربت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جو مشرقی ملکوں کا مقدر بن چکی ہے۔ بڑے شہروں میں ملازمت اور جسم فروشی واحد کاروبار ہے جو دیہات سے آنے والے لاکھوں افراد کا ذریعۂ معاش ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مذکورہ ملکوں میں عورتوں کی آبادی مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور تعلیم و ہنرمندی بھی عام نہیں ہے۔ اِس لیے جب ہزاروں کی تعداد میں لڑکیاں دیہات سے شہروں کا رُخ کرتی ہیں تو وہ کسی بھی قسم کے ہنر اور تربیت سے عاری ہوتی ہیں۔ ان کے لیے شارٹ کٹ یہی ہے کہ اپنا جسم فروخت کریں۔ شہروں کا رخ کرنے سے پہلے وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہوتی ہیں پھر جب شہروں میں نہایت منظم کاروباری گروہ ان کی مشکل کُشائی کی غرض سے موجود ہوں اور

ترغیب وتحریص کے تمام حربے بروئے کار لائے جائیں تو پھر ان بے بس لڑکیوں کو اس کے سوا کوئی دوسری راہِ نجات نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ بنکاک اور منیلا اور اب کسی حد تک کولمبو بھی اِس راہ پر چل نکلا ہے۔ سیاحوں کی دلبستگی کے مرکز بن گئے ہیں۔ سیاحوں کو ان مقامات پر نہایت ارزاں جنس دستیاب ہو جاتی ہے۔ ارزانی کا سبب بھی وہی ہے۔ یعنی مانگ اور فراہمی کا عدمِ تناسب۔ جس چیز کی مانگ کم ہو اور فراہمی بہت زیادہ۔ ظاہر ہے کہ اس کی قیمت بازار میں گر جائے گی۔ بنی نوعِ انسان کے ساتھ بھی یہی المیہ رونما ہوا ہے۔ آبادی بے اندازہ بڑھتی جا رہی ہے۔ وسائل اور ذرائع نہایت محدود ہیں۔ اور ضروریاتِ زندگی روز بروز گراں تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ لوازماتِ زندگی کی فہرست روز بروز طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ اِن حالات میں پسماندہ اور غیر ترقّی یافتہ معاشرے ناہمواری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ سفر تو مَیں نے کیا ہے مغرب میں اور مسائل بیان کر رہا ہوں مشرق کے۔ اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے اور یوں بھی اگر زیادہ گہرائی میں جا کر مطالعہ کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ آج مشرق جن عوارض اور مسائل کا شکار ہے ان کے اسباب وعوامل کا ذمّہ دار بھی مغرب ہے اور پھر لُطف کی بات یہ ہے کہ ان حالات پر اظہارِ ہمدردی بھی مغرب کے حلقوں میں کیا جاتا ہے اور ہمارے مشرقی دانشور ان مسائل کے حل کے لیے مغرب سے نسخہ تلاش کرتے ہیں ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطّار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں

بات یہ ہوئی کہ میرے قیام کینیڈا کے دوران میں وینکوور میں عالمی کونسل اور چرچ کا اجتماع ہوا۔ موضوعِ گفتگو تھا "تیسری دنیا کے ملکوں میں جسم فروشی اور طوائفیت کی بڑھتی ہوئی وبا اور عورتوں کا استحصال"۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ ان ممالک میں جسم فروشی کا دھندا

شروع کرانے والے بھی اہلِ مغرب تھے۔ پہلے جنگوں کے زمانے میں ان ممالک کو فوجیوں کی تفریح گاہ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا کیا گیا کہ یہ نہایت آسان اور کم خرچ دھندا ہے جس کے لیے انسانوں کے سوا کسی اور خام مال کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ پھر جب امریکی اور انگریز فوجیوں کی تعداد کم ہونے لگی تو مغرب سے سیّاحوں کے غول در غول سیر وتفریح کے بہانے نازل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ علاقے "سیاحوں کی جنّت" بن گئے۔ بدقسمتی سے ان میں سے کسی علاقہ میں بھی صحیح معنوں میں عوامی حکومتیں برسرِ اقتدار نہیں ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگوں کی کسمپرسی اور بے بسی بلکہ ذلّت وہانت کے بارے میں کسی نے سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی بلکہ اس کاروبار کو معاشی ترقّی کے لیے فالِ نیک سمجھ لیا گیا اور اب ان ہی مسائل پر غور کرنے کے لیے دور دراز مغرب کے شہر وینکوور میں عالمی گرجاؤں کی کونسل کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ جس میں تیسری دُنیا کی "مجبور" عورتوں کے استحصال کے بارے میں غور کیا جا رہا تھا۔

اب ذرا اِس اجلاس کی کارروائی ملاحظہ فرمائیے۔

تھائی لینڈ میں قائم شُدہ ایک ایجنسی کے سربراہ پیٹر ہولڈن نے اجلاس کو بتایا کہ ترقّی پذیر ملکوں میں جسم فروشی ایک انتہائی نازک مسئلہ بن چکی ہے۔ اس کا سبب انھوں نے بھی وہی بتایا جو مَیں لکھ چکا ہوں۔ یعنی غربت زدہ اور پسماندہ دیہات سے لوگوں کا شہروں کی طرف کوچ۔ ان کے بیان کے مطابق دیہات سے آنے والے مرد اور عورت جاہل، کُند نا تراش اور ہر قسم کے ہُنر سے عاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کو اپنا پیٹ پالنے کے لیے وہی شے فروخت کرنا پڑتی ہے جو اُن کو میسّر ہے یعنی جسم۔ اگر ان کے پاس کوئی اور چیز ہو تو وہ جسم فروشی پر مجبور نہ ہوں مگر دیہات میں تو انھیں رشتۂ حیات قائم رکھنے کے لیے پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی، تعلیم اور ہُنرمندی اور تربیت کا کیا سوال ہے؟ آبادی بہت زیادہ ہے۔ شہر کی طرف ہجرت کرنے والا ہر شخص اور ہر لڑکی اپنے پیچھے کنبوں کے درجنوں

افراد کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اِن بوڑھے، ناتواں کمزور اور بھوکے بچّوں کی کفالت کا واحد ذریعہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو شہروں میں جا کر کام کرتے ہیں۔ جیسے تیسے اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور آمدنی کا بڑا حصّہ دیہات میں بھیج دیتے ہیں۔

اجلاس میں سیاحت کے ایک ادارہ کے سربراہ نے بتایا کہ دیہات سے آنے والی ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کو سیاحت کے ادارے "فروغِ سیاحت" کے نام پر اُچک لے جاتے ہیں۔ اور حکومتیں بھی خوش ہو کر ان کے ساتھ تعاون کرتی ہیں کیونکہ سیاحت کے اداروں کے طفیل بے شمار سیّاح ان ممالک کی معیشت کو بہتر بنا رہے ہیں۔ اجلاس میں بعض رُوح فرسا انکشاف بھی کیے گئے۔ تھائی لینڈ کی ایک نرس نے بتایا کہ اِس ملک میں جنس ایک عام شے بن چکی ہے اور سیاحت کی کمپنیاں ہزاروں سیّاحوں کو ٹولیوں کی صورت میں لاتی ہیں جن کی تعطیلات کا بیشتر وقت ملک کو دیکھنے میں نہیں بلکہ ہوٹلوں کے بند کمروں میں گزرتا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے ایئرپورٹ اور ہوٹل کے علاوہ کوئی تیسری جگہ تک نہیں دیکھی ہوتی۔ نہ انھیں اس کی مہلت ملتی ہے، نہ وہ اس کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ یہ لوگ محض جسمانی لذّت کے لیے ان علاقوں کا رُخ کرتے ہیں۔ درجنوں بلکہ سینکڑوں نہایت منظّم ادارے ہر رنگ و نسل کی جنس فراہم کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ تھائی لینڈ کی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس ملک میں جسم فروشی اور طوائف نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ کہتے ہے نا چشم پوشی اور خود فریبی کی انتہا۔!

سیاحت کے ان طریقوں سے محض ان علاقوں کے ادارے ہی فائدے نہیں اُٹھاتے مغرب کے تاجر بھی خوب ہاتھ رنگتے ہیں مثلاً ہوائی کمپنیاں، ٹریول کمپنیاں، سیاحت کے ادارے۔ بے حسی کا اندازہ اِس بات سے لگائیے کہ یورپ اور امریکہ میں ان علاقوں کی سیاحت کے سلسلے کے جو پمفلٹ تیار کیے جاتے ہیں اِن میں کُھلے عام یہ بھی درج ہوتا ہے کہ بنکاک اور منیلا میں آپ اپنی جنسی ضروریات نہایت سستے داموں پوری کر سکتے ہیں۔

بہت سے ادارے انھیں "سیکس ٹورز" کا دلفریب نام دیتے ہیں۔ یہی نہیں بنکاک میں شادی کے لیے بھی رشتے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ گویا مختلف ناموں سے اور مختلف بہانوں سے عیّاشی کا دھندا چلایا جا رہا ہے۔

فلپائن کی ایک ڈاکٹر ارلینڈا نے بتایا کہ ان کے ملک میں جسم فروشی قانونی طور پر ممنوع ہے لیکن تھائی لینڈ کی طرح یہاں بھی یہ کاروبار عروج پر ہے۔ اس کاروبار کی رونق کا مستقل اور بڑا سبب اس ملک میں واقع امریکی فوجی مراکز بھی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان ممالک میں ان خرابیوں کی روک تھام کے لیے اقدامات بھی نہیں کیے جا رہے اِس لیے کہ مقامی حکام اسے "سیاحت اور ترقّی" کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ جسم فروشی ایک ایسی خرابی ہے جس کے شاخسانے کے طور پر منشّیات اور جرائم کا فروغ بھی ہوتا ہے اور ان چیزوں کا سب سے پہلا نشانہ گھریلو اور خاندانی زندگی بنتی ہے۔ رشتوں کی تمیز اور پہچان ختم ہو جاتی ہے، معاشرتی اقدار دم توڑ دیتی ہیں۔ خاندان اور کنبے تتر بتر ہو جاتے ہیں اِس کاروبار میں منفعت کا پہلو دیکھ کر پورٹوریکو، جنوبی امریکہ اور شمالی افریقہ سے بھی طوائفیں بہت بڑی تعداد میں "درآمد" کی جاتی ہیں۔ یعنی مغرب میں تو سیاحت سے دوکاندار ہوٹل، ہوائی کمپنیاں، ٹرانسپورٹ کمپنیاں، تفریح گاہیں اور مقامی صنعتیں فروغ پاتی ہیں اور مشرق میں محض جسم فروشی، منشّیات اور جرائم۔

اِقتصادی مشکلات

ڈیڑھ سال قبل مَیں نے امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کیا تھا تو وہاں اقتصادی حالات دگرگوں تھے۔ بے روزگاری اور مہنگائی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کاروں کی صنعت کساد بازی کا شکار تھی اور بہت سی کارساز کمپنیاں خسارے میں جا رہی تھیں۔ ہم اہل مشرق اِن خبروں کو سُن کر مطمئن تھے کہ غربت اور بے روزگاری صرف ہمارا ہی مقدّر نہیں ہے۔ امریکہ جیسا ملک بھی اس کی زد میں ہے۔ مگر اِن دنوں جب مَیں نے امریکہ کینیڈا اور انگلستان کا سفر کیا تو یہ احساس ہوا کہ باعمل اور زندہ اقوام اور بے عمل اقوام کے مابین کیا فرق ہے؟ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال کے دوران میں بے روزگاری اور مہنگائی پر قابو پانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ نقصان میں چلنے والی صنعتوں کو سنبھالا ملا ہے۔ بیروزگاری کم ہو گئی ہے۔ صنعتی ترقّی میں اضافہ ہُوا ہے۔ مثال کے طور پر کاروں کی صنعت ہی کو دیکھ لیجئے۔ ایک وقت تھا جب امریکی کارساز حکومت سے مطالبہ کر رہے تھے کہ انھیں جاپانی کاروں سے تحفظ دیا جائے مگر اس واویلا کے ساتھ ہی وہ عملی اقدامات میں بھی مصروف تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہم جو شمالی امریکہ گئے تو حالات کافی بدلے ہوئے تھے۔ نوکریاں آسانی سے ملنے لگی ہیں۔ کاروں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ مہنگائی بھی بڑھ گئی ہے مگر پٹرول کی قیمت کم ہو گئی ہے۔ بہت سی کھانے پینے کی چیزیں بھی سستی ہو گئی ہیں جبکہ

ہمارے ملک میں سب کچھ برعکس ہُوا ہے۔ پٹرول ساری دُنیا میں سستا مگر ہمارے ہاں مہنگا ہو گیا ہے۔ کھانے کی اشیاء انتہائی مہنگی ہو گئی ہیں۔ حیرت ہے کہ انڈے ان دنوں پاکستان میں نو دس روپے درجن ہیں جبکہ گرمی کا موسم ہے۔ اندازہ لگا لیجئے کہ موسم سرما میں ان کا نرخ کیا ہو گا۔ اِس کے مقابلے میں ان دنوں کینیڈا، امریکہ میں قریباً اسی قیمت میں یا سستے ہیں۔ وہاں ڈبل روٹی، دودھ وغیرہ کی قیمتیں بھی زیادہ نہیں بڑھی ہیں۔ پھل، ترکاری کے نرخ بھی ڈیڑھ دو سال میں زیادہ نہیں بڑھے جبکہ ہمارے ہاں اِن اشیاء کے نرخوں نے چھلانگیں بلکہ لانگ جمپ اور ہائی جمپ لگائی ہے۔ کاروں کی صنعت امریکہ اور کینیڈا میں قومی معیشت کا بیرومیٹر سمجھی جاتی ہے۔ اس کا احوال یہ ہے کہ پچھلے تین ماہ کے دوران امریکہ کے تین بڑے کارساز اداروں نے دو ارب ڈالر کا منافع کمایا ہے۔ ان اداروں کی منفعت کے ساتھ ساتھ یہاں روزگار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ کار کمپنیاں عموماً اچھے معاوضے دیا کرتی ہیں اور ہُنرمندوں اور کاریگروں تو بہت ہی اچھّے معاوضے دیئے جاتے ہیں، ایک تربیت یافتہ شخص کو عام طور پر بارہ تیرہ ڈالر (کینیڈین) فی گھنٹہ مل جاتا ہے گویا ایک دن کا معاوضہ قریب قریب سو ڈالر (بشرطیکہ صرف آٹھ گھنٹے کام کیا جاتے) اوور ٹائم کی صورت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے) اس طرح ہفتے کے چھ دن کا معاوضہ کم سے کم چھ سو ڈالر یعنی ۲۴ سو ڈالر مہینہ ہو گیا۔ یہ اس صورت میں ہے جب اوور ٹائم نہ کیا جاتے اور ہفتے میں صرف چھ روز کام کیا جاتے۔

ماہرین اقتصادیات نے اندازہ لگایا ہے کہ شمالی امریکہ میں صنعتی بحالی کے باوجود روزگار میں بہت زیادہ اضافہ نہیں ہو گا۔ لیکن ایک بات نہ بھولیئے۔ یورپ اور امریکہ میں بے روزگاری کا مطلب، وہ نہیں ہے جو ہمارے ملک میں یا مشرقی ممالک میں ہے بے روزگاری کے دوران میں بھی لوگوں کو وظیفہ ملتا رہتا ہے اور یہ وظیفہ ان کی اوسط آمدنی کے برابر ہوتا ہے۔ وہاں کے بے روزگار کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اسے مطلق کام

نہیں مل رہا۔ اس کی پرابلم یہ ہے کہ وہ اپنی پسند اور اپنے معیار کے مطابق روزگار نہیں حاصل کر سکا اس لیے بے کار ہے۔ چنانچہ حکومت اسے بے روزگاری کے ایام میں وظیفہ دینے کی پابند ہے۔ ہمارے ایک پاکستانی دوست کو کینیڈا میں ہر ہفتہ دو سو ڈالر بے روزگاری الاؤنس مل رہا تھا جبکہ ان کی ایک بہن کو قریباً ایک سو بیس ڈالر فی ہفتہ بے روزگاری الاؤنس ملتا ہے۔ اس طرح لاکھوں افراد ایسے ہیں جو گھر بیٹھے بے روزگاری الاؤنس وصول کرتے ہیں اور ملک میں بے روزگاری میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ بے شمار پاکستانی، بھارتی، سیاہ فام اور دوسرے ایشیاتی اور جنوبی امریکہ کے ممالک سے آئے ہوئے افراد تو جان بوجھ کر کوئی کام نہیں کرتے اور بے روزگاری الاؤنس اینٹھتے رہتے ہیں۔ ان ملکوں کا بے روزگار بھی کاروں میں گھومتا ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ گھروں میں رہتا ہے اور اچھا کھاتا پہنتا ہے۔ اس لیے جب میں اپنے ملک کے بیوروکریٹس اور مالیاتی بازی گروں کی زبانی یہ دلیل سنتا ہوں کہ بھائی بے روزگاری تو یورپ اور امریکہ میں بھی خوب زوروں پر ہے تو بہت حیرت ہوتی ہے۔ یہ حضرات جانتے بوجھتے الفاظ اور اعداد و شمار کے ہیر پھیر کے ذریعہ عوام الناس کو بہلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی نااہلی اور عدم کارکردگی کو حق بجانب قرار دینے کے لیے بودی دلیلیں دیتے ہیں اور ان کا ضمیر انھیں مطلق ملامت نہیں کرتا۔

جہاں تک تنخواہوں اور معاوضوں میں اضافہ کا تعلق ہے۔ ان کو بھی بدقسمتی سے ہمارے ملک میں لفاظی اور اعداد و شمار کے مخملیں پردوں میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے اور سند کے طور پر مثال پیش کی جاتی ہے یورپ اور امریکہ کی۔ حالانکہ ہمارے ہاں معاوضوں میں اضافے برائے نام ہوتے ہیں جبکہ اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اضافے بے حد بے شمار۔ مثلاً کینیڈا کے ویلڈرز کو فی ہفتہ سوا دو ہزار ڈالر کے لگ بھگ معاوضہ ملتا ہے اور وہ اب اس میں بھی اضافے کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ بہت جان

ماری اور جوکھوں کا کام ہے اور کوئی شخص چھ سات سال سے زیادہ اس کام میں مصروف نہیں رہ سکتا اس لیے زیادہ معاوضہ ملنا چاہیئے۔ اسی طرح شمالی امریکہ میں کاروں کی صنعت سے وابستہ کارکنوں نے معاوضوں میں اضافے کا مطالبہ کیا تو کمپنیوں نے انھیں ایک ڈالر فی گھنٹہ اضافے کی پیش کش کی یعنی ۸ ڈالر روزانہ اور ۴۰ ڈالر فی ہفتہ اور قریباً دو سو ڈالر مہینہ۔ مگر مزدوروں نے پیش کش ٹھکرا دی۔ ان دنوں مزدوروں کی یونینوں اور کمپنی کے حکام کے مابین مذاکرات ہو رہے ہیں۔ مقصد کہنے کا صرف یہ ہے کہ اگر مسائل کی پردہ پوشی کرنے کی بجائے ان کا مقابلہ کرنے اور صدقِ دل سے انھیں حل کرنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

عُہدے اور فائدے

صدر ریگن جب انتخاب میں برسرِ پیکار تھے تو بہت سے اداکار ان کے زبردست حامی تھے۔ کچھ مخالف بھی تھے۔ اداکارہ جون فونڈا کا وہ فقرہ تو آپ نے پڑھا ہوگا کہ "ریگن گھٹیا اداکار تھے اور بوگس صدر ثابت ہوں گے" مگر اداکاروں کے طبقے نے ریگن صاحب کو منتخب کرانے میں بہت نمایاں حصّہ لیا۔ خصوصاً اداکار اور گلوکار فرینک سیناترا نے تو زمین آسمان کا زور لگا دیا۔ وہ ریگن اور مسز نینسی ریگن کے بہت پرانے دوست ہیں۔ صدر کینیڈی سے بھی انھیں قُرب حاصل رہا مگر بعد میں جانسن، فورڈ اور کارٹر دَور میں وہ "مخصوص لوگوں" کی فہرست سے خارج ہوگئے۔ بلکہ ان پر رسوائے زمانہ مُجرم جماعت "مافیا" سے تعلق رکھنے کا الزام بھی لگایا گیا اور بہت لے دے ہوئی اگرچہ ان کے خلاف یہ الزام ثابت نہ ہوسکا کہ ان کا "مافیا" کی مجرمانہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق بھی تھا۔

ریگن صدر منتخب ہوتے تو فرینک سیناترا کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑا۔ صدر ریگن کی رسمِ صدارت کا جشن منانے کے لیے فن کاروں نے ایک تقریب منعقد کی جس میں بے شمار معروف اداکار اور فلمی ستارے جگمگا رہے تھے۔ جن میں فرینک سیناترا کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ فن کاروں کی طرف سے جو تقریب منعقد ہوتی تھی اس کے رُوحِ رواں بھی سیناترا

ہی تھے۔ ایک اور اداکار ادرٹی وی کی شخصیت جانی کارسن تقریب کے اناؤنسر تھے صدر ریگن اور بیگم نے بڑے اہتمام سے اِس تقریب میں شرکت کی جو دو گھنٹے جاری رہی امریکہ کے واحد فائیو اسٹار جنرل ادمر بریڈلے نے بھی اس میں شرکت کی (اگرچہ وہ وہیل چیئر پر تھے اور چند ہفتے بعد ان کا انتقال ہوگیا) ان کی وہیل چیئر اداکار جیمز سٹیورٹ چلا کر لائے جو فوج میں عہدیدار بھی رہ چکے ہیں۔

فرینک سیناترا نے اِس تقریب میں بڑے زور شور سے گانے گائے اور مسز نینسی ریگن کی تعریف میں خاص طور پر ایک نغمہ سنایا۔ ریگن اور مسز نینسی ریگن کا مارے خوشی کے بُرا حال تھا۔ تقریب کے خاتمے سے پہلے ہی نینسی سٹیج پر آگئیں اور فرطِ خوشی سے سیناترا کو گلے لگا کر بوسہ لے لیا اس طرح سب پر واضح ہوگیا کہ فرینک سیناترا کے دن بدل گئے ہیں چنانچہ چند ہفتے بعد انھوں نے جب قمارخانے کے لائسنس کے لیے درخواست دی (جو پہلے مسترد ہوچکی تھی) تو سب کو علم تھا کہ یہ منظور ہوجائے گی۔ گریگری پیک، راک ہڈسن اور برٹ لنکاسٹر جیسے اداکاروں نے سیناترا کو شرافت اور انسانیت کی بھلائی کا خصوصی سرٹیفکیٹ عطا کیا اور انھیں لائسنس مل گیا۔ سیناترا جو پہلے ہی ارب پتی ہیں ان کے لیے اِس فیصلے کے مالی پہلو میں کوئی منفعت نہ تھی۔ دراصل اس کی اصل اہمیت یہ تھی کہ ان کا "رعب داب" پھر بحال ہوگیا۔ صدر ریگن کے استقبال میں جو تقریب منعقد ہوئی وہ ٹی وی پر دکھائی گئی اور اس کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ بعض اداکاروں نے دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ صدر ریگن پر بھی فقرے چُست کیے اور پھبتیاں کسیں۔ صدر نے کھُلے دل کے ساتھ مذاق کا لُطف اُٹھایا خاص طور پر جب ایک اداکار نے صدر نکسن، فورڈ اور صدر کارٹر کی نقل کی اور بعد میں صدر ریگن کی نقل اتاری تو صدر کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا۔ اسی پر منحصر نہیں ہے ٹی وی پروگراموں میں اداکار اور اداکارائیں اکثر صدر ریگن اور نینسی ریگن پر پھبتیاں کستے اور فقرے چُست کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں لطیفہ بازی کی جاتی ہے

امریکی معاشرے کا یہ پہلو واقعی قابلِ قدر ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے سے بالاتر اور نکتہ چینی سے مبرا نہیں سمجھا جاتا۔

کیا عہدوں سے فائدہ اٹھانا محض پاکستان ہی تک محدود ہے؟ جی نہیں یہ بیماری ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن محض انداز مختلف ہیں۔ بھارت میں اندرا گاندھی کے صاحبزادے اور پاکستان میں حکمرانوں کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں اکثر اپنے والدین کے امتیازی مقام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کے مجرم ٹھہراتے جاتے ہیں لیکن امریکہ جیسے جمہوری ملک میں بھی یہ بات انہونی نہیں ہے۔ صدر کارٹر کے بھائی بلی کارٹر کے واقعات تو یہاں اخباروں میں بہت عام ہو رہے ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ لیبیا سے کاروبار کرنے اور عربوں کے موقف کی حمایت کرنے کے زیادہ سزاوار تھے اور امریکی پریس نے جس پر یہودیوں کی اجارہ داری ہے ان کو اپنا ہدف بنا لیا تھا یہاں تک کہ صدر کارٹر کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کہنا پڑا کہ بلی بہت خود مختار قسم کا انسان ہے اور اس کے کسی قول اور فعل پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے پھر بھی بعض حلقوں میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صدر کارٹر کی ناکامی اور زوال میں بہت بڑا حصہ ان کے بھائی کا بھی تھا اور بلی کارٹر کا یہ قصور امریکی پریس نے آج بھی معاف نہیں کیا ہے۔ اب بھی ان کو مذاق اور نکتہ چینی کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔

خیر۔ یہ تو جملۂ معترضہ تھا ذکر ہو رہا تھا حکمرانوں کے رشتے داروں اور اولاد کا۔ امریکہ کے صدر ٹرومین بڑے دھڑلے کے صدر تھے۔ ان کی بیٹی نے ایک موسیقی کی تقریب میں حصہ لیا تو ایک اخبار نے اس پر نکتہ چینی کی اور لکھا کہ مارگریٹ ٹرومین کا گانا بہت خراب تھا۔ صدر ٹرومین کو اتنا غصہ آیا کہ آستینیں چڑھا کر مارنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بڑی مشکل سے انھیں سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا گیا۔

پچھلے دنوں صدر ریگن کے بیٹے رونی ریگن کا واقعہ اخباروں کی زینت بنا۔ صدر

کے بیٹے ایک بہت بڑے کاروباری ادارے کے مشیر ہیں اور ایک اسلحہ فراہم کرنے والی کمپنی کے صدر ہیں۔ ریگن کے صدر منتخب ہونے کے بعد انھوں نے تمام اسلحہ ساز کمپنیوں کو خط لکھا جس میں لکھا تھا کہ میرے والد کے صدر منتخب ہونے کے بعد امریکہ کے فوجی استحکام پر بہت زور دیا جا رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اسلحہ کے لیے آرڈر دیتے وقت ہماری کمپنی کو ضرور یاد رکھیں گے۔

یہ خط کوئی صحافی لے اُڑا اور اخباروں میں لے دے شروع ہو گئی کہ رونی ریگن نے اپنے باپ کے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ رونی ریگن نے صفائی میں کہا کہ اگر میں نے اپنے باپ کے دورِ حکومت میں امریکہ کے فوجی استحکام کا تذکرہ کر دیا تو کون سا ظلم ہو گیا؟ اس پر مشہور کالم نویس آرٹ بک ویلڈ نے کالم لکھا جس میں رونی ریگن کا خوب مذاق اُڑایا اور لکھا کہ باتوں باتوں میں لوگوں کو باپ کے مرتبے سے کس طرح مرعوب کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال اِس چیخ و پکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ رونی ریگن نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور وہائٹ ہاؤس سے باقاعدہ ایک تردیدی اور وضاحتی بیان جاری ہوا اور ساتھ ہی صدر کی اولاد کے لیے ایک ہدایت نامہ بھی جاری کیا گیا کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ خود نینسی ریگن نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ رونی کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

دیکھی آپ نے جمہوری نظام کی شان اور صحافت کی قوت۔ امریکی بھی انسان ہی ہیں کمزوریوں کا شکار بھی ہو جاتے ہیں لیکن اگر کوئی کوتاہی علم میں آ جاتے تو جواب طلبی کا عمل شروع ہو جاتا ہے تحقیقات ہوتی ہیں۔ عدالتی کارروائیاں ہوتی ہیں اور بڑے سے بڑا اور مقتدر سے مقتدر شخص بھی احتساب سے نہیں بچ سکتا۔ سوچیے کیا ہمارے ہاں بھی ایسا ہوتا ہے؟ یا ہو سکتا ہے؟!!! یہی فرق ہے ایک زندہ قوم اور ایک بے عمل قوم میں

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صدر نکسن جیسے مضبوط اور با اختیار انسان کو بالآخر بہت بے آبرو ہو کر قصرِ صدارت سے نکلنا پڑا تھا اور اس کی وجہ کیا تھی ؟ دو اخبار نویسوں نے ان کی ایک کوتاہی کا سُراغ لگایا اور اسے منظرِ عام پر لاتے اور پھر احتساب کا وہ عمل شروع ہوا جس کے نتیجے میں بڑے بڑے اختیار عہدیدار برطرف ہوتے۔ بعض جیل پہنچ گئے اور خود صدر نکسن بھی جیل جانے سے بال بال ہی بچ سکے۔

احتساب کا ایک اور پہلو گزشتہ دنوں دیکھنے میں آیا جب کہ مس امریکہ کے مقابلے میں شریک ایک امیدوار پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے اپنے جسمانی خطوط کو مزید دلکش اور نظر فریب بنانے کے لیے مصنوعی چیزوں کا سہارا لیا تھا۔ بس پھر کیا تھا بے چاری کو مقابلے سے معطل کر دیا گیا۔ اب وہ اخباروں میں بُہتیرے بیان شائع کراتی ہیں اور ٹی وی پر انٹرویو دیتی پھرتی ہیں مگر مس امریکہ کا اعزاز ان کے قابو سے نکل گیا۔

سگریٹ نوشی زندگی کو گھٹا دیتی ہے یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے لیکن پچھلے دنوں دو مختلف اور متضاد نظریات کا اظہار کیا گیا۔ ایک ادارے نے یہ نتیجہ نکالا کہ جو لوگ سگریٹ نوشی ترک کرتے ہیں ان کی صحت بہتر اور زندگی طویل ہو جاتی ہے جب کہ لندن یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ کے ایک پروفیسر ہانس آئی سنک یہ دُور کی کوڑی لاتے کہ سگریٹ نوشی سے بہت سی بیماریاں لاحق نہیں ہوتیں۔ سگریٹ نوشی کرنے والے افراد بعض نوعیت کے کینسر اور اعصابی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ انھوں نے اعداد و شمار سے یہ پتہ چلایا کہ پائپ اور سگار پینے والے افراد میں دل کے امراض کا اوسط سگریٹ نہ پینے والوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ پروفیسر ہانس نے اس نظریے کو بھی چیلنج کیا ہے کہ سگریٹ نوشی سے عارضہ قلب اور پھیپھڑوں کا کینسر ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بیان کے ثبوت میں ٹھوس شہادتیں موجود نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی ڈاکٹروں نے یہ خیال عام کر دیا ہے۔ شکاگو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر پیٹر پولیس نے بھی پروفیسر ہانس کے

خیالات سے اتفاق کیا ہے۔

تازہ ترین مردم شماری کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ امریکی گھرانے جو پہلے ہی "مختصر" تھے اب اور "مختصر" ہو گئے ہیں۔ امریکی گھر سکڑ رہے ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۰ء میں ہر امریکی گھرانے میں اوسطاً ۴٫۱ افراد رہا کرتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں یہ اوسط کم ہو کر ۳٫۵ ہو گیا لیکن اب امریکی گھرانہ اوسطاً ۲٫۸ افراد پر مشتمل ہے۔ واشنگٹن میں یہ اوسط ۲٫۳۹ ہو گیا ہے لیکن نیویارک جیسے شہروں میں ان کا اوسط محض ۱٫۹۲ ہو گیا ہے۔ بعض لوگ یہ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ امریکہ میں خاندانوں اور گھرانوں کا تصور متروک ہو جائے گا اس لیے کہ مردوں اور عورتوں کی اکثریت "کنوارہ" اور تنہا رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ بیشتر مرد اور عورتیں شادی کے بغیر ہی گزارہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے گھر میں رہتے ہیں۔ شادی کے بعد بھی بیشتر جوڑے "بچّوں" کی مصیبت سے بچنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی آبادی میں بھی بہت کم اضافہ ہوا ہے۔ خصوصاً سفید فام آبادی کے اضافے کی رفتار بے حد کم ہے جبکہ کالوں میں زیادہ بچّے پیدا کرنے کا رجحان ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو امریکہ میں کالوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔

خاندانی منصوبہ بندی کا ایک اور نقصان یہ ہوا ہے کہ ملک میں نوجوانوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے بہتر خوراک اور بہتر طبّی سہولتوں کی وجہ سے لوگوں کی اوسط عمریں بڑھ گئی ہیں ادھر بچّے نہ پیدا کرنے کا فیشن چلا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچّوں نوجوانوں اور جوانوں کی تعداد بوڑھوں سے کم ہونے والی ہے۔ ماہرین اس فکر میں دُبلے ہو رہے ہیں کہ اگر یہ رجحان نہیں بدلا تو کام کیسے چلے گا ؟

فلمیں

مغرب میں ہر موضوع پر ہر فلم ساز نہ صرف فلم بنا سکتا ہے بلکہ ایسی فلمیں کامیاب بھی ہوتی ہیں۔ مغرب کے لوگ اس بارے میں کتنے آزاد خیال ہیں اس کا اندازہ "پورپ" کے بارے میں بنائی جانے والی فلم سے لگایا جا سکتا ہے۔ پولینڈ کے ایک ہدایت کار نے جو اٹلی میں پیدا ہوا تھا، دس ملین ڈالر (تقریباً دس کروڑ روپے) کی لاگت سے پوپ کی زندگی کے بارے میں ایک فلم بنائی۔ یہ فلم پوپ کے بچپن جوانی اور بڑھاپے کے حالاتِ زندگی پر مبنی ہے۔ اس میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ لڑکپن میں پوپ نے اداکاری کا شوق بھی پورا کیا۔ پھر دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں وہ نازیوں کے کیمپ میں بھی گرفتار رہے۔ یہاں تک کہ فلم میں پوپ کا وہ رومان بھی دکھایا گیا ہے جو پادری بننے سے پہلے انھوں نے ایک نوجوان لڑکی سے کیا تھا۔ پولینڈ کے ایک اداکار ماراوسکی نے اس فلم میں "پوپ" کا کردار ادا کیا ہے۔ فلم ۱۹۷۹ء تک کے واقعات پر مبنی ہے جب کہ پوپ اپنے وطن پولینڈ گئے تھے۔ ہدایت کار نے پچھلے دنوں ایک خصوصی شو میں پوپ کو یہ فلم ویٹیکن میں دکھائی۔ پوپ کے ساتھ ویٹیکن کے وزیرِ خارجہ اور دوسرے حکام بھی موجود تھے۔ فلم کے خاتمے پر پوپ نے جذباتی ہو کر ہدایت کار کو گلے لگا لیا اور کہا کہ خدا تمھیں اس کا اجر دے گا۔ اپنے بچپن کے واقعات اور بچپن کے دوستوں

کو فلم میں دیکھ کر پوپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہمارے ملک میں تو فلمی صنعت کا ستارہ گردش میں ہے اور اس کی زندگی کے لالے پڑے ہوتے ہیں۔ مگر امریکہ میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سال رواں میں امریکی فلمی صنعت نے پچھلے تمام سالوں کے مقابلے میں زیادہ روپیہ کمایا ہے اور کامیاب ہونے والی فلموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے فلم سازوں نے ایک بار پھر بڑے بڑے اداکاروں کو لے کر بڑی لاگت کی فلمیں بنانی شروع کر دی ہیں۔ خیال ہے کہ ۱۹۸۱ء فلمی صنعت کے لیے انتہائی کامیاب اور یادگار سال ثابت ہوگا۔ فلموں کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ وارنر کی ایک فلم "سپرمین ٹو" نے پہلے نو ہفتے میں تقریباً ۹۰ ملین ڈالر کمائے (ان کا حساب روپوں میں خود ہی لگا لیجیے) پیرامونٹ کی فلم "ریڈرز آف دی لوسٹ آرک" آمدنی میں اس سے بھی بڑھ گئی ہے اس نے پہلے دس ہفتے میں تقریباً ایک سو گیارہ ملین کمائے ہیں۔ اس وقت بھی یہ فلم امریکہ کے ۱۲۵۰ سینما گھروں میں نہایت کامیابی سے چل رہی ہے۔

اب فلموں کا ذکر چل نکلا ہے تو چلتے چلتے ایک دلچسپ بات اور سن لیجیے۔ ہمارے ملک میں بھی بے شمار فلمیں ایسی ہیں جنھیں مکمل ہونے کے بعد نمائش کے قابل نہیں سمجھا جاتا یا انھیں گھاٹے کا سودا سمجھ کر انھیں مکمل کرنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی جاتی اور وہ ڈبوں میں پڑی اسٹوڈیو کی لیبارٹری کی زینت بن جاتی ہیں۔ ہالی ووڈ میں بھی ایسی فلموں کی کوئی کمی نہیں ہے ایک اندازے کے مطابق تقریباً تین ہزار فلمیں ایسی ہیں جنھیں نمائش کے قابل ہی نہیں سمجھا گیا۔ بعض نامکمل ہیں انھیں مکمل کرنے کے لیے محض پچاس ساٹھ ہزار ڈالر درکار ہیں مگر کوئی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اب ایک نوجوان جان ایلن نے فلمی کباڑیے کا کردار ادا کرنے پر کمر باندھ لی ہے اس نے چند بے کار فلمیں اونے پونے خریدیں اور نمائش کے لیے پیش کیا۔ ان فلموں نے باکس آفس پر بہت کامیابی حاصل کی۔ جس سے ایلن کا حوصلہ بڑھا اور اب وہ مزید

اِس قسم کی مزید فلیں ریلیز کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا کام صبح سے رات گئے تک "ڈبّہ فلیں" دیکھنا ہے جو پسند آتی ہے وہ کمپنی سے خرید لیتا ہے۔ کمپنی سمجھتی ہے جو آتا ہے وہی غنیمت ہے جو فلیں اس نے دیکھی ہیں ان میں بڑے بڑے اداکاروں اور ہدایت کاروں کی فلمیں بھی شامل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی دُنیا کی بدترین فلم منتخب کرنے کا ارادہ کرلے تو مجھ سے زیادہ کوئی اور اس کام کے لیے موزوں نہیں ہے۔

دیمک!

امریکہ، خوبصورت، سرسبز اجناس، پھلوں پھولوں اور سبزیوں سے لدا ہوا امریکہ پچھلے چند مہینوں سے ایک نئی وبا کا شکار ہوگیا ہے۔ پہلے تو اس کی نزاکت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکا مگر اب پتہ چلا ہے کہ امریکی معیشت ایک انتہائی ہیبت ناک خطرے سے دوچار ہے ہُوا یہ کہ چند ماہ قبل ریاست کیلی فورنیا کے ایک علاقے میں ایک مہلک مکھی کا پتہ لگا اسے "میڈفلائی" کا نام دیا گیا۔ یہ مکھی خطرناک وبائی جراثیم کی حامل ہے اور خیال ہے کہ یہ اپنے جراثیم نہ صرف انسانوں تک بلکہ دوسرے پھلوں تک پہنچا سکتی ہے۔ فصلوں پر دواؤں کے اسپرے کا کام شروع کیا گیا اور لاکھوں ڈالر اس پر خرچ ہوتے۔ دوسری امریکی ریاستوں اور بیرونی ملکوں نے دریں اثنا کیلی فورنیا سے پھل خریدنے بند کر دیئے۔ اسپرے کے باوجود اس مکھی کا دائرہ اثر بڑھتا ہی چلا گیا اور اب نہ صرف کیلی فورنیا کے چند دوسرے علاقوں میں بلکہ امریکہ کی کچھ اور ریاستوں میں بھی اس مکھی کا پتہ چلا ہے جس کے بعد سارے امریکہ میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی ہے۔ نکتہ چینوں کا کہنا ہے کہ کیلی فورنیا کے گورنر نے دوائیاں چھڑکنے کی کارروائی میں اتنی تاخیر کی کہ یہ مکھی اپنی نسل بڑھانے میں کامیاب ہوگئی اس مکھی کی وجہ سے محکمہ زراعت کو اب تک ۱۴ بلین کا نقصان ہوچکا ہے اور ابھی تک اس خطرے پر قابو نہیں پایا گیا۔ ابھی اِس مصیبت سے نجات نہیں ملی تھی کہ بعض ایسے

حشرات الارض کا پتہ چلایا گیا ہے جو فصلوں اور مکانوں کے لیے دشمنِ عظیم ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عناصرِ فطرت نے (نہ جانے کیوں) امریکی حکومت کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے مثلاً ریاست میری لینڈ اور مین کے علاقوں میں ایسی دیمک کا سراغ لگایا گیا ہے جو کسی زمانے میں یورپ کے لیے تباہی کا پیغام بن گئی تھی۔ مگر اب یہ دبا امریکہ میں پہنچ گئی ہے اس دیمک کا سراغ اس وقت لگتا ہے جب یہ اندر ہی اندر اپنا کام کر چکی ہوتی ہے۔ یہ دیمک ایک پورے گھر کو چھ ماہ کے اندر چٹ کر سکتی ہے۔ ریاست فلوریڈا کے ایک مکان کی لکڑی کی چھت اچانک گر گئی۔ دیکھا تو پتہ چلا کہ دیمک نے چھت کو کھا لیا تھا یہ دیمک پلاسٹر سے گزر کر لکڑی تک پہنچ جاتی ہے۔ یونیورسٹی آف فلوریڈا کے ماہر حشرات الارض فلپ کوچ کا کہنا ہے کہ اس دیمک کا خاتمہ تقریباً ناممکن ہے۔ اسے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ آپ اس بات کا انتظار کرتے رہیں کہ کب وہ گھر کو چٹ کرنے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ اِس دیمک کی دریافت نے سارے ملک میں ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ امریکہ (اور کینیڈا) میں زیادہ تر مکان لکڑی کے بنے ہوتے ہوتے ہیں اور ہر چیز میں لکڑی کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ "ناقابلِ علاج" دیمک پھیلنے لگی تو انسان کہاں جائیں گے؟

پاکستان میں بہت سی صنعتیں ایسی ہیں جو اپنی بقا کے لیے حکومت سے تحفظ مانگتی ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ درآمد پر پابندی عائد کر دی جائے۔ دور کیوں جاتے ہیں۔ پاکستان کی فلمی صنعت کو ہی دیکھ لیجئے۔ یہ صنعت اپنی کم مائیگی اور دوسری مشکلات کی خاطر حکومت سے تحفظ کی طالب ہے۔ پاکستان کی فلمی صنعت تو بہت بے مایہ اور مختصر سی صنعت ہے جس کے وسائل نہایت ہی محدود ہیں لیکن آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت نہ ہو کہ امریکہ اور کینیڈا جیسے صنعتی ترقی یافتہ، باوسائل اور دولت مند ملکوں کی صنعتیں بھی بیرونی ممالک کی "یلغار" سے بچنے کے لیے تحفظ کی طالب ہیں۔ امریکی حکومت عرصہ دراز سے موٹر سازی

کی صنعت کی طرف سے دباؤ میں ہے کہ جاپانی کاروں کی درآمد پر پابندی عائد کر دی جائے یا انھیں محدود کر دیا جائے کیونکہ مقامی صنعت جاپانی کاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ صدر ریگن کی حکومت نے اس مطالبے کے پیشِ نظر جاپان کی حکومت سے کچھ تحفظات بھی حاصل کیے ہیں۔

کینیڈا میں بھی یہی شور ہے کہ "خدارا ہمیں جاپانی کاروں سے بچائیے"۔ جاپانی کاروں نے امریکہ کی طرح کینیڈا میں بھی بہت مقبولیت حاصل کر لی ہے اور ان کی درآمد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ جاپانی کاروں کی درآمد اب تک ۲۴ فیصد تھی۔ مگر پچھلے ماہ جاپانی کاروں کی فروخت بڑھ کر ۲۱ فیصد ہو گئی ہے جس نے مقامی کاروں کی صنعت کو بوکھلا دیا ہے۔ اِس سے پہلے یہاں فالتو پُرزوں کی درآمد ۲۳ فیصد تھی جس میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ مقامی کاروں کی فروخت اِتنی کم ہو گئی ہے کہ بہت سے کارخانے بند ہو گئے ہیں اور کئی کارخانوں نے مزدوروں میں تخفیف کر دی ہے جس کی وجہ سے بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مقامی کاروں کی فروخت میں ۴۰ فیصد کمی واقع ہو گئی ہے جو سالِ رواں میں اور بھی کم ہو جائے گی۔ اِن حالات سے تنگ آ کر فورڈ کمپنی جیسی عظیم کمپنی کے صدر نے کینیڈا کی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ جاپانی کاروں کی درآمد کو محدود کیا جائے ورنہ مقامی صنعت تباہ ہو جائے گی۔ بے روزگاری پھیلے گی اور مُلکی معیشت مزید زبوں حال ہو گی۔ اب تک تو حکومت کا یہ کہنا تھا کہ بھئی لوگ جو چیز پسند کرتے ہیں اُنھیں ملنی چاہیئے مگر اب حالات اِتنے نازک ہو گئے ہیں کہ حکومت اِس مسئلہ پر غور کرنے لگی ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ امریکہ اور کینیڈا کی اتنی بڑی اور پرانی صنعت کو تحفظ نہیں ملنا چاہیئے؟

پچھلے دنوں مغربؔ کے ایک مشہور مفتی جان لینن کو ایک شخص نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ سارے امریکہ اور یورپ میں سوگ منایا گیا۔ جان لینن نے اپنی بیوہ کے لیے کروڑوں

روپے کی جائیداد اور بے اندازہ مستقل رائلٹی کی آمدنی چھوڑی ہے۔ ان کی موت کے بعد ان کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کی ۱۹۵۶ء کی ایک پرانی کار اگلے ماہ نیلام کی جا رہی ہے جس کے لیے ابھی تک دو لاکھ اسّی ہزار ڈالر کی بولی لگ چکی ہے مگر موجودہ مالک نے اس قیمت پر فروخت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ بہت پرانی کار ہے جس کا رنگ و روغن بھی ٹھیک نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود خیال ہے کہ یہ تقریباً چار لاکھ ڈالر تک نیلام ہو جائے گی۔

منشیات

منشیات کی روک تھام کے لیے ہمارے ملک میں بھی بہت کوششیں ہو رہی ہیں اور لوگوں کو پکڑا جا رہا ہے لیکن پاکستان میں جس طرح دوسرے قوانین پر عمل کرایا جاتا ہے وہی حال منشیات کے قوانین کا بھی ہے۔ جب ٹریفک کے تمام قوانین کی موجودگی کے باوجود ہمارے شہروں پہ ایک لاقانونی سرزمین کا گمان گزرتا ہے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ منشیات کی روک تھام کے قوانین پر کس تندہی سے عمل کرایا جاتا ہو گا؟ جبکہ منشیات کے تاجروں کے پاس خدا کے فضل و کرم سے کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ موجود ہے اور سرکاری محکموں سے کالی بھیڑیں تلاش کرنے میں انھیں زیادہ تردد اور پریشانی نہیں ہوتی ہو گی۔ منشیات میں ملوث لوگ کبھی پکڑے بھی جاتے ہیں لیکن عموماً ٹرک ڈرائیور قسم کے لوگ ہی قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھ آتے ہیں۔ اصلی لوگ پس پردہ ہی رہتے ہیں۔ اکثر تو یہ خبر آتی ہے کہ ایک کار یا ٹرک کو گھیر کر اتنی بھاری مقدار میں ہیروئن پکڑی گئی مگر مجرم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر کسٹم والے بھی آئے دن چھاپے مارتے رہتے ہیں اور کروڑوں اربوں روپے مالیت کی ہیروئن پر قبضہ کر لیتے ہیں مگر محض ہیروئن پر، تاجروں تک کسٹم والوں کا ہاتھ پہنچتا ہے، نہ پولیس والوں کا۔ بہرحال اس معاملے میں شکایت بھی نہیں کرنی چاہیے کہ اب ہمارے ملک میں قانون کے

نفاذ کا یہی چلن ہو گیا ہے۔ ہیروئن اور دوسری منشیات کی لعنت پاکستان کے لیے بھی اتنی ہی تباہ کُن ہے جتنی کسی اور ملک کے لیے ہو سکتی ہے اور پاکستانی قوم اور معاشرے کو بھی اس کی روک تھام کے لیے حتی الامکان موثر کارروائی کرنا چاہیئے۔ مگر دوسرے کاموں کی طرح اس محاذ پر بھی ہمارے محکمے وہی کر رہے ہیں جو کافی نہیں ہے۔

یہ تو پاکستان کی حد تک ایک سرسری جائزہ ہے۔ جہاں تک امریکہ اور یورپ کا تعلق ہے۔ منشیات کی وبا پہلے وہاں پھیلی اس کے بعد پاکستان میں اس کی قدر و منزلت شروع ہوئی۔ جو امریکی حکام اور دانشور اٹھتے بیٹھتے پاکستان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان میں اس لعنت کے انسداد کے سلسلے میں ضروری اقدامات نہیں کیے جا رہے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہیروئن اور دوسرے نشوں کا استعمال امریکہ اور یورپ میں اس وقت بھی عام تھا جب پاکستان والے ہیروئن کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ اس وقت افیم اور چرس قسم کے نشے پاکستان میں ہوا ضرور کرتے تھے مگر یہ بہت سستے نشے تھے اور فیشن میں بھی داخل نہ تھے بلکہ عموماً افیمی اور چرسی معاشرے میں بُری نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس وقت امریکہ اور یورپ ہیروئن کی کشید میں مصروف تھے اور ان کی قوم کے نوجوان اس نئے تجربے کی سنسنی خیزی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اگر امریکہ اور یورپ کی حکومتیں اتنی ہی محتاط اور فکر مند ہیں تو انھوں نے ابتدا ہی میں منشیات کی روک تھام کے لیے ضروری اقدامات کیوں نہیں کیے؟ اس وقت تو پاکستان اتنی بڑی تعداد میں ہیروئن وغیرہ تیار بھی نہیں کرتا تھا۔ اور نہ برآمد کرتا تھا۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستان اور دُنیا بھر کے دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں منشیات کو سونے کی تجارت میں تبدیل کرنے والے خود مغربی تاجر ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے پاکستان میں چرس اور افیم وغیرہ نہایت حقیر اور بے حیثیت نشے تھے۔ چند روپے میں نشے باز اپنا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ مگر اس کو باقاعدہ تجارت بنانے والے امریکہ اور یورپ ہی کے لوگ ہیں۔ آپ اخبار میں پڑھتے ہوں گے کہ کسٹم

والوں نے اتنی بڑی مقدار میں ہیروئن پکڑی ہے جس کی قیمت بیرونی مارکیٹ میں اتنے کروڑ روپے ہے۔ یعنی پاکستان تو اس نشے کو اب بھی کوڑیوں کے مول فروخت کر رہا ہے اربوں کھربوں کی آمدنی سے تجوریاں مغربی اسمگلر اور تاجر ہی بھر رہے ہیں اور پھر بھی سارا الزام غریب پاکستان کے سر ہے۔

دیکھا جائے تو اب تک ہر بُری چیز مغرب سے مشرق کی طرف آتی رہی ہے، پہلے چائے اور کافی آئی اور آپ کو یاد ہو گا کہ اسے مقبول بنانے کے لیے مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ جب لوگوں کو چائے کی عادت پڑ گئی تو چائے اور کافی کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا اور اربوں روپے سالانہ کا کاروبار ہو گیا۔ شراب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ شراب کوئی مفید چیز تو نہیں ہے۔ کوئی معاشرہ اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر امریکہ اور یورپ نے شراب کی تجارت کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ مشرقی ملکوں کو شراب کی بوتلوں میں غرق کر دیا۔ ہمارے ملکوں کے نوجوان لڑکے لڑکیاں اور دوسرے طبقے شراب کے عادی ہوتے چلے گئے اور مغرب میں شراب کشید کرنے والی کمپنیاں اربوں کھربوں پونڈ کماتی رہیں۔ یہ زہر بھی مغرب ہی کے راستے مشرق میں پہنچا۔ اس کے بعد تمباکو اور سگریٹ کو لے لیجئے۔ تمباکو کا زہر مغربی فیکٹریوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ طرح طرح کے تمباکو، قسم قسم کی سگریٹیں، کیسے کیسے دلکش اور دلنواز اشتہارات کی مدد سے لوگوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔ سگریٹ کے بارے میں اب معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کس قدر مہلک زہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی سگریٹ ساز کمپنیوں نے اب اپنی توپوں کا رُخ مشرق کی طرف پھیر دیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں سگریٹ نوشی پر سخت پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔ لوگوں کو ان کے نقصانات سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ ان میں سگریٹ نوشی کے خلاف شعور اور مدافعت پیدا کی جا رہی ہے۔ مگر تیسری دُنیا کے ملکوں میں سگریٹ کی ریل پیل ہو گئی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں تمباکو اور سگریٹ نوشی میں معتدبہ کمی کے باوجود سگریٹ اور تمباکو بنانے والوں کی آمدنیاں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ سگریٹ کا

دھواں آج بھی مشرق میں مہنگے داموں درآمد کیا جا رہا ہے۔ ان کے روک تھام اور انسداد کے لیے امریکہ اور یورپ کے دانشوروں اور ماہرین قانون نے کبھی کوئی قدم اٹھانے کی تو کیا سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اگر آج امریکہ اور یورپ ہیروئن کے سمندر میں ڈوب چکے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود وہاں کے اسمگلروں اور جرائم پیشہ گروہوں پر ہے جن کا اوّل و آخر مقصد ہی دولت کمانا ہے۔ ہیروئن کو ہیروئن بنانے والے پاکستانی نہیں ہیں اسے یہ شکل امریکہ اور یورپ والوں نے دی ہے۔ آج جب ہیروئن کے نقصانات واضح نظر آنے لگے ہیں تو امریکہ اور یورپ والوں کو فکر پڑ گئی ہے۔ وہ مشرقی ممالک کی حکومتوں کو غیر مؤثر کارروائیوں کے طعنے دے رہے ہیں۔ لیکن خود امریکہ جیسے ترقی یافتہ قانون اور نظم و ضبط میں بندھے ہوئے معاشرے میں ہیروئن کی روک تھام کے لیے اقدامات کتنے مؤثر اور کامیاب ثابت ہوتے ہیں؟ اس کا جواب مایوس کن حد تک نفی میں ہے۔

رہا پاکستان کے کسٹم والوں کا رویہ تو ذرا مغربی ممالک کی بھی سُن لیجئے۔ جن دنوں مَیں لندن میں تھا ایک اخبار میں نہایت مفصّل مضمون شائع ہُوا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ برطانیہ میں ہیروئن کی پرابلم خطرناک رفتار سے بڑھ رہی ہے مگر علاج معالجے اور انسداد کی کارروائیاں اس کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ برطانیہ میں دس ہزار رجسٹرڈ نشہ باز ہیں لیکن درحقیقت ان کی تعداد لاکھوں میں پہنچی ہوئی ہے۔ یہ وبا محض بڑے شہروں تک محدود نہیں ہے۔ چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بھی یہی حال ہے۔ کسٹم والے ہیروئن کی روک تھام کے لیے جو اقدامات کر رہے ہیں وہ بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق برطانیہ میں کسٹم والے جتنی ہیروئن پکڑتے ہیں اس سے ۷۰۰ گنا زیادہ ملک میں درآمد ہو جاتی ہے۔ منشّیات کے عادی افراد کے علاج کے لیے بہت سے ادارے قائم ہیں مگر ان کی تعداد ضرورت سے کہیں کم ہے اور سہولتیں بھی پوری نہیں ہیں۔

برطانوی انڈر سیکرٹری مسٹر ڈیوڈ میلور نے ان ہی دنوں امریکہ کا دورہ کیا اور

واپسی پر ایک معلومات آفریں مضمون لکھا۔ انھوں نے لکھا "ایک محاورے کے مطابق جب امریکہ کو چھینک آتی ہے تو یورپ نمونیہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ معاشیات کی حد تک تو درست ہوگا لیکن جہاں تک منشّیات کا تعلق ہے یوں سمجھئے کہ امریکہ شدید بخار میں مبتلا ہے اپنے آٹھ روزہ دورے میں مجھے امریکہ کے تمام منشّیات اور جرائم کے اڈوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ سرکاری محکموں اور اعلیٰ حکام سے بھی بات چیت ہوئی۔ مَیں جس سے بھی ملا اس نے کہا کہ منشّیات اس وقت امریکہ کی نمبر ایک پرابلم ہے۔ امریکہ میں ہر روز دُنیا کے مختلف ملکوں سے کشتیوں، بحری جہازوں، ہوائی جہازوں، کاروں اور دوسرے ذرائع مواصلات کی مدد سے بے اندازہ منشّیات درآمد کی جا رہی ہیں۔ ریاست جارجیا کے اٹارنی جنرل نے مجھے بتایا کہ ۷۰ فیصد جرائم میں منشّیات کے تاجر اور اسمگلر ملوث ہیں۔ دوسروں کی تو چھوڑیئے امریکی سوسائٹی اور حکومت کے اعلیٰ ترین افراد کوکین اور ہیروئن کے نشے میں مبتلا ہو چکے ہیں جو امریکیوں اور حکومت کے لیے شدید تشویشناک امر ہے قریباً ۴۰ لاکھ امریکی باقاعدگی سے کوکین استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ کوکین بھی اتنی ہی خطرناک اور مہلک چیز ہے جتنی کہ ہیروئن۔ امریکی معاشرے میں دوسرے نشوں کی طرح کوکین کو بھی مقبولیت حاصل ہے۔ دراصل کوکین اور ہیروئن جڑواں بہنیں ہیں۔ یکساں مہلک اور زہرناک۔ دونوں کا عادی ہو جانے کے بعد اِس عادت سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے امریکہ میں دس بارہ سال کی عمر کے بچّے بھی اِن نشوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور جو بچّہ ایسا نہیں کرتا اس کو دوسرے بچّے نہ صرف بُرا اور بُزدل سمجھتے ہیں بلکہ زبردستی بھی اسے نشہ کرا دیتے ہیں۔ امریکہ میں شدید انسدادی سزاؤں کے باوجود منشّیات کی لعنت پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ دوسری طرف جیلوں کا یہ حال ہے کہ جارجیا میں منشّیات کے جُرم میں ایک قیدی کو جو ۳۰ سال قید کی سزا بھگت رہا تھا محض ۱۷ ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔ یہی حال دوسری ریاستوں کا بھی ہے۔

اِتنی دولت، ترقی یافتہ ٹیکنالوجی، انسداد کے جدید ترین سائنسی طریقوں کے باوجود امریکہ اور یورپ منشیات پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں۔

اور پھر یہ بھی نہ بھولیے کہ اب تک تو ہر وبا، اور لعنت مغرب ہی سے مشرق میں آتی رہی ہے۔ شراب، تمباکو، سگریٹ، نشہ آور ادویات، مہلک اور جان لیوا دوائیں، خطرناک بیماریاں، چائے۔ کافی کی لت۔ حد تو یہ ہے کہ ادویات کے نام پر مشرق کے ترقی پذیر ملکوں کو ایسی دوائیں بھیجی جاتی رہی ہیں جن کا استعمال خود مغرب میں ممنوع قرار دیا جا چکا ہے، اِس کے علاوہ نت نئے شرمناک فیشن، جدیدیت کے نام پر معاشرتی خرابیاں، تعلیم کے نام پر قومی قدروں سے انحراف اور بغاوت، قرضوں کے نام پر تیسری دُنیا کے ملکوں کو گروی رکھنے کی ترکیبیں۔ یہ سب مغرب والے ہمیں عطیے کے طور پر دیتے رہے ہیں۔ اب اگر مشرق کی طرف سے انھیں محض ایک بُراتی ہیروتن کی شکل میں ملی ہے تو اس پر اتنا شور و غل کس لیے؟!

شادیِ مغربی سٹائل

مغربی معاشرہ اپنی اس خوبی پر نازاں ہے کہ وہ لوگ عصرِ حاضر کے بدلتے ہوتے حالات کے مطابق اپنے طور طریقے اور دستور بھی بدل لیتے ہیں اور یہ انقلاب یا تبدیلی کسی شور و شر یا توڑ پھوڑ کے بغیر ہوتی ہے۔ جس طرح جمہوری حکومتوں میں انتخاب کے بعد نہایت غیر محسوس طریقے پر اقتدار کے ایوانوں میں خاموشی اور سکون کے ساتھ حکومت کے سربراہوں کا تبادلہ ہو جاتا ہے اِسی طرح نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ معاشرتی قدروں اور رواجوں کو بھی حالات کے مطابق نئے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ نہ اس کے مخالف صفِ ماتم بچھاتے ہیں اور نہ ہی اس کے حامی فتح و نصرت کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ اس صدی میں خصوصاً دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ اور امریکہ میں معاشرتی اور اخلاقی قدروں میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ سنسنی خیز ہیں۔ آپ خواہ اتفاق کریں یا نہ کریں "جیو اور جینے دو" کے اصول کے مطابق اہلِ مغرب نے اپنی ضرورتوں کے مطابق معاشرتی رسم و رواج میں انقلابی ترمیمیں کی ہیں اور اپنی اس کارکردگی پر وہ بہت نازاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر اسکولوں میں جنسی تعلیم کے مسئلے کو ہی لے لیجیے۔ ابتداء میں جب یہ تجویز پیش ہوتی کہ اسکولوں میں جنسی تعلیم کو رواج دیا جائے کیونکہ اِس سے مستقبل کے شہریوں میں ایک اہم انسانی مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گی تو لوگوں

کی بہت بڑی تعداد نے اس کے خلاف بہت شور مچایا، لیکن اکثریت کی منظوری سے اصولی طور پر یہ تجویز منظور کرلی گئی اور ابتدا میں تجرباتی طور پر اسکولوں میں جنسی موضوعات کی تعلیم کا شروع کر دیا گیا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ اس کے نتائج ہولناک اور تباہ کُن نکلیں گے لیکن اکثریت اس کے حق میں تھی۔ چنانچہ اکثریت کی مرضی نافذ کر دی گئی، اسکولوں میں جنسی تعلیم عام ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی جنسی آزادی بھی بڑھ گئی۔ شروع شروع میں روایت پسندوں اور قدامت پرستوں نے بہت شدید مخالفت کی۔ مگر پھر دہی اکثریت کی رائے سدِراہ بنی اور رفتہ رفتہ انھوں نے اِن تبدیلیوں کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کرلیا۔ اِس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس انتہائی اہم انقلابی معاشرتی تبدیلی کو مغربی معاشرے نے بتدریج سہی، لیکن بالآخر قبول کرلیا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ تمام کے تمام شہری اِن ضابطوں کو پسند کرتے ہیں۔ جی نہیں۔ بہت سے لوگ ان "آزادیوں" کے سخت مخالف ہیں اور ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔ پچھلے دنوں جب ہم امریکہ میں مقیم تھے تو ریاست ورجینیا کے اسکولوں میں ان آزادیوں کے خلاف ایک مضبوط آواز اٹھائی گئی تھی۔ چرچ اور والدین کی خاصی تعداد ان کی اسی طرح مخالف تھی جس طرح ہم اور آپ ہیں۔ آئے دن اخبارات میں ان "آزادیوں" اور بے ہودگیوں کے خلاف مضامین اور مباحثے پڑھنے میں آتے تھے۔ مگر جب رائے شماری ہوتی تو پتہ چلا کہ "قدامت پسندوں کی تعداد پندرہ سے بیس فیصد کے لگ بھگ ہے"۔ چنانچہ "آزادیوں" کو سلب کرنے کی تحریک مسترد کر دی گئی اور اسکولوں میں نوعمر طلبہ اور طالبات کے بے روک ٹوک میل جول کو مزید آزادی دے دی گئی۔ بیس فیصد مخالفین نے بہت پیچ و تاب کھائے مگر اس فیصلے کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرلیا۔ اگرچہ اس رواج کے خلاف ان کا تحریری اور تقریری محاذ بدستور سرگرم عمل ہے۔

اِس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ پچھلے دنوں "جنگ"

میں ایک کالم نگار کے قیام کینیڈا کے دوران پیش آنے والے تاثرات نظر سے گزرے انھوں نے ایک ٹی وی مذاکرے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ پُرجوش خاتون مردوں کی طرف سے خواتین کے استحصال کے خلاف بہت زور شور سے بول رہی تھیں۔

جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ کی شادی ہوچکی ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا "مَیں سنگل، شادی شدہ ہوں"۔ اس جواب سے صاحبِ مضمون نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ محترمہ نے صرف ایک مرتبہ شادی کی ہوگی جبکہ اس موضوع پر ہمارا مشاہدہ اور مطالعہ قدرے مختلف ہے۔ یورپ اور امریکہ میں مرد و زن کے باہمی رشتے اور شادی بیاہ کے بارے میں نظریات میں بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ اس "ٹوٹ پھوٹ" کا آغاز تو خواتین کی برابری کی تحریکوں کے بارآور ہونے کے ساتھ ہی ہوچکا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ عورتوں کو مزید "عائلی آزادی" حاصل ہوئی۔ طلاق کے قوانین اتنے نرم ہوگئے کہ شوہر کے چھینک مارنے اور بیوی کے خراٹے لینے کے سوال پر بھی میاں بیوی طلاق کے حق دار ہوگئے۔ اس طرح میاں بیوی کا رشتہ ایک مذاق بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طلاقوں کی بھرمار ہوگئی۔ ایک طرف عورت کو معاشی آزادی حاصل ہوئی اور اسے احساس ہوا کہ پیٹ بھرنے کے لیے مرد کی محتاج نہیں ہوں۔ دوسری طرف مرد کی برابری کی دُھن میں بیگمات نے شوہروں سے دوبدو، مقابلہ شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے گھریلو سکون درہم برہم ہوگیا۔ تیسری طرف معاشرے اور حکومت نے بڑی آسانی سے طلاق حاصل کرنے کی کھلی چھٹی دے دی اِس پر طُرفہ تماشہ یہ کہ اولاد کا باہمی بندھن بھی کمزور پڑتا چلا گیا۔ طلاق کی صورت میں بچے ماں یا باپ میں سے کسی ایک کی تحویل میں ہی جاتے ہیں یا سرکاری ادارے ان کی پرورش کی ذمہ داری اٹھا لیتے ہیں گویا ماں اور باپ دونوں کو اس بوجھ سے چھٹکارہ حاصل ہوگیا۔ اِس طرح طلاقوں کی رفتار بڑھنے لگی۔ اور میاں بیوی کا رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا۔

سوسائٹی نے جیسے جیسے جنسی اور معاشی ڈھیل دینی شروع کی ویسے ویسے رسم و رواج میں تبدیلی آتی گئی۔ اس وقت شادی بیاہ کے جو بندھن مغرب میں موجود ہیں وہ ہماری طرح کے نہیں ہیں۔ شادی کی ایک قسم تو وہ ہے کہ چرچ یا کورٹ میں جاکر شادی کر لی اور میاں بیوی ہنسی خوشی رہنے لگے۔ مگر یہ قسم اب کم ہوتی جا رہی ہے اور ڈر ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ باضابطہ اور "باقاعدہ" شادی کہیں عنقا ہو کر نہ رہ جائے۔ وجہ معاشی بھی ہے اور معاشرتی بھی۔ مغربی ممالک میں ٹیکسوں کا نظام یہ ہے کہ میاں بیوی کی مشترکہ آمدنی اور ملازمت پر ٹیکس عاید کیا جاتا ہے اور ہماری طرح صرف عائد ہی نہیں کیا جاتا بلکہ وصول بھی کر لیا جاتا ہے، یہ متوسط اور عام طبقے کے لیے۔ ایک غیر ضروری بوجھ ہے۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے انھوں نے نت نئے رواج اپنا لیے ہیں مثلاً ایک تو بالکل سیدھا سادا ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟ ایک مرد اور عورت یکجا رہنا چاہتے ہیں تو بخوشی رہیں۔ ضروری تو نہیں کہ وہ شادی بھی کریں۔ چنانچہ یہ دستور اب عام ہوتا جا رہا ہے جب تک مناسب سمجھا اور گزارہ ہوا ساتھ رہے اور اس کے بعد راضی خوشی دونوں نے اپنی اپنی راہ لی اور کوئی دوسرا ہمسفر ڈھونڈ لیا۔ اس "شادی" کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ بس ساتھ رہتے ہیں بگاڑ لیجیے جو بگاڑ سکتے ہیں۔ دوسری یہ کہ دوستوں کے حلقے میں بتا دیا کہ بھئی ہم "میاں بیوی" بن گئے ہیں۔ اسے آپ "بے ضابطہ" اور "غیر رسمی" شادی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ شادی ہے جس کے لیے سنگل "شادی شدہ" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے کیونکہ مغربی معاشرہ ہم سب سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرہ ہے اور ترقی کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کی روایات سے مکمل بغاوت کر دی جائے۔ اس لیے وہاں آئے دن "آزادی" کے نام پر نت نئے بندھن قائم ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض ریاستوں میں ہم جنسوں کی شادی ہو جاتی ہے اور یہ باضابطہ شادی ہوتی ہے۔ عورت عورت سے شادی کر کے زندگی بسر کرتی

ہے اور مرد کی شادی مرد کے ساتھ ہو جاتے تو سوسائٹی یا قانون کو اعتراض نہیں ہوتا۔ اب رہ گئے بچے۔ تو یہ مسئلہ بھی زیادہ پریشان کن نہیں ہے۔ مغربی معاشرہ اوّل تو بچے کی پیدائش کے حق ہی میں نہیں ہے۔ ایک طرف شادی شدہ ماؤں کی اوسط بڑھ رہی ہے لیکن دوسری طرف شادی شدہ ماں باپ کی اولاد گھٹ رہی ہے۔ عمر کے کسی مرحلے پر میاں بیوی کو بچوں کا بہت زیادہ شوق ہوا تو خاندانی منصوبہ بندی کے تحت ایک دو بچوں کے خالق بن گئے ورنہ یہ تکلیف گوارا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کسی ادارے سے جا کر من پسند بچہ لے آئے اور اس کو متبنیٰ بنا لیا۔ اس قسم کے اداروں کی وہاں کمی نہیں ہے جہاں بچے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ "بچے" غیر قانونی ماں باپ ان اداروں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے قانونی جوڑے بھی ہیں جو علیحدگی کی صورت میں بچوں سے قطعی تعلق کر لیتے ہیں اور ایسے بچے ان پناہ گاہوں میں پرورش پاتے ہیں۔ بچوں سے مغرب میں ماں باپ کی وابستگی بس اس حد تک ہی ہوتی ہے، ہمارے پیمانے سے ناپیں تو یہ کوئی وابستگی ہی نہیں ہے اسی لیے طلاق کے بعد بچے بڑی آسانی سے ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے سپرد کر دیے جاتے ہیں دونوں میں سے کوئی بھی یہ بوجھ نہ اٹھانا چاہے تو انھیں خرچہ دے کر دوسرے رشتہ داروں کے حوالے کر دیتے ہیں ورنہ پھر لاوارث بچوں کے سرکاری ادارے تو موجود ہی ہیں۔ اس لاتعلقی کے عالم میں پرورش پانے والے بچوں کو اوّل تو اپنے حقیقی ماں باپ کا پتہ ہی نہیں ہوتا، اگر پتہ ہوتا بھی ہے تو ان سے جذباتی اور ذہنی وابستگی برائے نام ہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہی ماں باپ بوڑھے اور معذور ہو جاتے ہیں تو اولاد ان سے بے خبر اور بے تعلق ہو چکی ہوتی ہے اور اب بوڑھے ماں باپ کی باری ہے کہ وہ معذور گاہوں اور بوڑھوں کی پناہ گاہوں میں زندگی بسر کریں اور اس طرح زندگی رواں دواں رہتی ہے۔

شادی ایک مقدّس رشتہ اور قابلِ عزت ادارہ ہے اس ایک رشتے کی مضبوطی پر

خاندان اور سوسائٹی کی عمارت استوار ہوتی ہے جب تک ہمارے معاشرے میں یہ بنیادی پتھر مضبوطی سے اپنی جگہ قائم ہے اخلاقی قدریں اور پرانی روایتیں بھی باقی رہیں گی۔ جس دن سے یہ کمزور ہوا ساری معاشرتی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔

اب تو مغرب میں شادی ایک رسم بھی نہیں رہی۔ تو پھر بچّوں کی پیدائش اور پرورش تو لامحالہ غیر اہم ہو کر رہ گئی ہے۔

ترقی یافتہ امریکہ میں بے شمار ایسے علاقے اور سر بفلک عمارتیں ہیں جہاں صرف "جوڑے" رہ سکتے ہیں۔ اگر بچّوں کے ساتھ ہیں تو آپ نہ ان "جنّت نظیر" علاقوں اور عمارتوں میں اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کر سکتے ہیں نہ خرید سکتے ہیں۔ اب ایسے علاقوں عمارتوں ہوسٹلوں اور ہوٹلوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جہاں بچّوں کا داخلہ ممنوع ہے شمالی امریکہ میں نوجوانوں اور بچّوں کی آبادی تشویشناک حد تک گھٹتی جا رہی ہے جب کہ بوڑھوں کی تعداد میں پریشان کُن حد تک اضافہ ہو گیا ہے جو معاشرے اور سرکاری خزانے پر بوجھ ہیں۔ منصوبہ بندی کے ماہرین اب اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ اس صورت حال کو کیسے تبدیل کیا جائے؟ آزاد معاشرے میں لوگوں کو زبردستی شادی کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے نہ صاحبِ اولاد ہونے کے لیے ان پر زور ڈالا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر امریکہ میں غیر یوروپی نسلیں نہ ہوں تو غالباً یہاں آبادی کی افزائش بالکل ہی رُک جائے۔ اٹلی، اسپین، میکسیکو، پاکستان، بھارت، چین، جنوبی ایشیا اور دوسرے غیر یوروپی ملکوں کے آبادکار بے روک ٹوک آبادی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہی حال کالوں کا بھی ہے۔ سفید فام امریکیوں کے برعکس کالوں کے خاندان چار سے آٹھ بچّوں تک پر مشتمل ہوتے ہیں، جو لوگ یہ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مستقبل قریب میں امریکہ کی بیشتر ریاستوں میں سیاہ فاموں کی آبادی بڑھ جائے گی وہ غلط نہیں کہہ رہے۔ امریکہ میں غیر یوروپی سیاہ فام آبادی کا پھیلاؤ آئندہ تیس سالوں میں سفید فاموں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ایسا ہی اندیشہ انگلستان

میں بھی ظاہر کیا جا رہا ہے۔ یہاں بھی صورتِ حال قریب قریب وہی ہے۔ باہر سے آنے والی اقوام کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے جبکہ مقامی آبادی سمٹ رہی ہے اور وہ دن بہت زیادہ دُور نہیں ہے جب انگریز خود اپنے ملک میں اقلیت ہو جائیں گے۔

امیر کناڈا کے غریب لوگ

کینیڈا ایک ایسا ملک ہے جس کا رقبہ بے حد عریض اور وسائل بے انتہا ہیں۔ آبادی مقابلتاً بہت کم ہے۔ ٹورنٹو جو کینیڈا کا سب سے بڑا شہر ہے اس کی آبادی ۲۲ لاکھ سے بھی کم ہے۔ اردگرد کے شہروں کی آبادیاں ایک لاکھ، دو لاکھ، بیس ہزار یہاں تک کہ ایک ہزار سے بھی کم ہیں۔ وسائل کا یہ عالم ہے کہ بے شمار معدنی ذخائر دریافت کیے جا چکے ہیں مگر انھیں استعمال میں نہیں لایا گیا۔ لامتناہی وسائل کے بارے میں علم ہے کہ وہ زیرِ زمین موجود ہیں لیکن فی الحال انھیں محفوظ رکھا جا رہا ہے، خیال ہے کہ پچاس یا سو سال کے بعد جب کہ دنیا اپنے زیرِ زمین ذخائر اور وسائل کو کام میں لا چکی ہوگی کینیڈا کے پاس معدنی ذخائر اور وسائل کا بہت بڑا ذخیرہ ہوگا۔

ملک خوشحال اور نہایت ترقی یافتہ ہے۔ شہر بہت خوبصورت ہیں۔ ٹیکنالوجی میں کینیڈا کی ترقی حیران کُن ہے۔ میڈیکل سائنس میں کینیڈا کے پاس دُنیا کے بہترین ڈاکٹر، سرجن اور جدید ترین ہسپتال موجود ہیں۔ امریکہ سے کینیڈا آ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ملک امریکہ کے مقابلے میں گراں ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ اب بھی دُنیا کا سب سے سستا ملک ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء اور ملبوسات اور جوتے وغیرہ خاص طور پر امریکہ میں ارزاں ہیں اور اگر امریکہ میں جو لوگ رہتے ہیں ان کی آمدنی کے پیشِ نظر دیکھا جائے

تو بیشتر اشیاء پاکستان سے بھی زیادہ سستی ہیں۔ کینیڈا امریکہ کے مقابلے میں گراں ہے لیکن یہاں آمدنی کا معیار بھی امریکہ سے زیادہ ہے۔ پچھلے دنوں ایک جائزے میں بتایا گیا کہ کینیڈا کے سرکاری ملازمین کی تنخواہیں امریکہ کے مقابلے میں ۲۲ فیصد زیادہ ہیں۔

یہ سب اپنی جگہ بجا ہے لیکن اِس تصویر کا ایک دوسرا رُخ ہے۔ اور وہ رُخ ہے معیارِ زندگی اور اخراجات زندگی میں روزافزوں اضافہ۔ جس رفتار سے گرانی بڑھ رہی ہے اس رفتار سے آمدنی نہیں بڑھ سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اخراجاتِ زندگی کے بوجھ تلے دبتے جا رہے ہیں۔ اشیاء کے نرخوں کی شرح ۲۱ فیصد سے بھی زیادہ ہو چکی ہے جس کا اثر اب روزمرّہ کے عوامل پر بھی پڑ رہا ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ لوگ مکانوں، دکانوں، کاروبار اور گھریلو اشیاء کے لیے جو قرضے لیتے ہیں ان کے سود کی شرح میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ تو غالباً آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ امریکہ اور کینیڈا میں معاشی نظام قرضوں کی بنیاد پر استوار ہے۔ ضرورت کی ہر چیز قرضے پر دستیاب ہو جاتی ہے۔ یہ ادارہ بڑھ چڑھ کر کوشش کرتا ہے کہ لوگ اس سے قرضہ حاصل کریں۔ کریڈٹ کارڈ، ایک ایسی چیز ہے جس کے بغیر شمالی امریکہ میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص کے پاس متعدد اداروں کے "کریڈٹ کارڈز" ہیں۔ عام لوگوں کی بلند معیارِ زندگی کا سب سے بڑا سبب "قرضے" ہی ہیں۔ اگر قرضوں کا معاشی نظام تبدیل کر دیا جائے تو عام لوگوں کا معیارِ زندگی آسمان سے زمین پر آ گرے گا۔ ہر شخص ائر کنڈیشنڈ، مکان، کاریں رنگین ٹی وی، فرنیچر اور دوسری اشیاء خریدنے کا متحمل نہیں ہوگا۔ اس وقت تو یہ حال ہے کہ محض دستخط کر کے جو چاہے خرید لیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ باقاعدگی سے قرضے واپس بھی کریں۔ جو شخص قرضے کی واپسی میں کوتاہی کرتا ہے سمجھئے کہ اس کی تقدیر پھوٹ گئی۔ ہر ماہ قرضے کے حساب میں ادائیگی ضروری ہے یہ اور بات ہے کہ ہر ادارہ یہ چاہتا ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ قسطوں میں قرضے ادا کریں تاکہ ان کا سود بھی زیادہ سے زیادہ ہو۔ عام

آدمی اس سے یہ فائدہ اُٹھاتا ہے کہ چھوٹی قسطوں میں قرضے ادا کرنے کی وجہ سے وہ دوسری بے شمار چیزیں بھی قرضے میں خرید سکتا ہے۔ اندازہ یوں لگائیے کہ جس شخص کی آمدنی بارہ سو ڈالر ماہانہ ہے وہ محض چھ سات سو ڈالر ماہانہ قرضوں کی قسطیں ادا کر کے دُنیا کی ہر نعمت اپنے لیے خرید سکتا ہے۔ ہر مہینے وہ مکان، کار اور دوسری اشیاء کے حساب میں کچھ رقم باقاعدگی سے ادا کرتا رہتا ہے۔ قرض خواہوں کا سود بڑھتا جاتا ہے یہاں تک سود اصل سے بھی بڑھ جاتا ہے اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان ملکوں میں ہر شخص کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے مگر کیونکر طرزِ زندگی ہی یہ ہے اور کوئی بھی "قرض" کی لعنت سے محروم نہیں ہے اِس لیے کوئی اِس مسئلے کو اہمیت نہیں دیتا مگر ان لوگوں کے عیش اور قرضوں کا انبار دیکھ کر مرزا غالب کا ایک شعر بہت یاد آتا ہے۔ ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

چنانچہ "فاقہ مستی" یوں رنگ لاتی ہے کہ زندگی بھر آپ قرضے ادا کرتے رہیں۔ قرضے کے بعد آپ کی جائیداد اور دوسری اشیاء سے قرضے وصول کیے جائیں گے۔ قرضے میں شوہر اور بیوی دونوں شامل ہوتے ہیں اس لیے ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کو قرضوں کا ڈھیر ادا کرنا پڑتا ہے۔

اس تمہید اور تعارف کے بعد اب آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ جب سے افراطِ زر میں اضافہ ہوا ہے مہنگائی بڑھی ہے اور بنکوں کے سود کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ عام لوگوں کی زندگی پر اس کا کتنا زبردست اثر پڑا ہوگا۔ بنکوں کے سود کی شرح چھ سات فیصد سے بڑھ کر ۲۰-۲۱ فیصد تک ہوگئی تو پہلے پہلے تو عام کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی مگر جب ان کے قرضوں کی ادائیگی کی رقوم میں اضافہ ہونے لگا تو انھیں پتہ چلا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ بس یہیں سے معاشی بدحالی، کی داستان کا آغاز

ہوا۔ اور چیزوں کو تو چھوڑیئے سب سے پہلے مکانوں اور کاروں کی بات کیجئے۔ مکان قرضوں پر خریدے جاتے ہیں اور خریدار پیشگی "رقم" کی ادائیگی کے بعد زیادہ تر قرض لمبی قسطوں میں ادا کرتا ہے۔ مگر سود کی شرح میں اضافے کے باعث ماہانہ قسط کی رقم میں بھی اضافہ ہو گیا ہے، مثال کے طور پر جس مکان کے قرض کی یہ ماہانہ قسط ۵۲۲ ڈالر تھی اب وہ ۸۷۲ ڈالر ماہانہ ہوگئی ہے۔ ایک ماہ میں صرف مکان کی قسط میں ساڑھے تین سو ڈالر کا اضافہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے جبکہ ضروریاتِ زندگی کی دوسری اشیاء میں بھی بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں رواج یہ ہے کہ لوگ اپنی ساری آمدنی ہر مہینے قرضے چکانے میں خرچ کر دیتے ہیں اور پھر بھی قرضے باقی رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ محض گھر کی قسط کے لیے ساڑھے تین سو ڈالر کہاں سے آئیں؛ چنانچہ لوگوں نے اس کے خلاف مہم شروع کی ہے مگر اس کا خاطر خواہ اثر ہوگا یہ ممکن نہیں نظر آتا۔ ساری معیشت کو کس طرح تبدیلی کیا جا سکتا ہے!

یہ تو مالکانِ مکان کی داستانِ غم تھی۔ اب ذرا، کرایہ داروں کی حالتِ زار پر ایک نظر ڈال لیجئے، مکانوں کی قیمتوں اور بنک سود کی شرح میں اضافہ کی وجہ سے مکانوں کے مالک مکانوں کا کرایہ بڑھانے پر مجبور ہیں ورنہ وہ اپنے قرضے کہاں سے اور کیونکر ادا کریں؟ اِس لیے کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا ہر مکان اور ہر عمارت قرضے پر ہی خریدا جاتا ہے۔ پھر جائیدادوں کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ ٹیکسوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا تان آکر عام آدمی پر ٹوٹتی ہے۔ مکانوں کے کرایہ میں جو ہوشربا اضافہ ہوا ہے اس کا اندازہ یوں لگا لیجئے کہ ٹورنٹو میں سرکاری عمارتوں کے کرایوں میں پچھلے چھ ماہ میں ۱۶۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ تین بیڈروم کے جس مکان کا کرایہ اس وقت ۲۸۲ ڈالر ماہانہ ہے یکم اکتوبر کا اس کا کرایہ ۴۶۲ ڈالر ماہانہ ہو جائے گا اور اپریل ۱۹۸۹ء میں اس کا کرایہ ۷۵۰ ڈالر ماہانہ ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ محض ایک سال کے

اندر کراتے میں اس ہوشربا اضافہ کا سدباب کیسے ہو اور رقم کہاں سے لاکر ادا کی جائے۔ نہ صرف عام لوگوں کے لیے بلکہ حکومت کے لیے بھی یہ مسئلہ ایک ناقابلِ فہم اُلجھن بنا ہُوا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کو سر چُھپانے کے لیے جگہ حاصل کرنا دوبھر ہوتے لگا ہے۔

عام آدمی پر ان چیزوں کا کیا اثر پڑا ہے اور آئندہ جا کر وہ کس حد تک ان باتوں سے متاثر ہوگا اس کے ثبوت میں محض دو خبریں ملاحظہ کر لیجئے اور پھر یہ غور کیجئے کہ ہمارے ملک میں جو لوگ اِس خیالی جنّت میں رہتے ہیں کہ مغرب میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں وہ کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔

بہت سے لوگ حد سے بڑھے ہوئے کرائے یا مکانوں کے قرضوں کی اقساط ادا کرنے سے قاصر ہیں چنانچہ انھیں مکانات سے بے دخل ہونا پڑ رہا ہے۔ اِس معاشرے میں جہاں اولاد بھی ماں باپ کو اپنے ساتھ رکھنے کی روادار نہیں ہوتی وہ کہاں جائیں؟ نہ کسی رشتے دار کے پاس جا سکتے ہیں۔ نہ ایک چھوٹا سا مکان لے کر بہت سے افراد سکونت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ حکومت کی طرف سے ایسے قوانین موجود ہیں جن کے تحت ایک کمرے میں میاں بیوی کے سوا دو افراد نہیں رہ سکتے۔ ایک بچّے کے والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ دو بیڈروم کا گھر حاصل کریں اور دو بچّوں کے ماں باپ کے لیے تین بیڈروم کا گھر لینا لازم ہے۔ شاید ان ہی وجوہات کی بنا پر یہاں لوگ بہت کم اولاد پیدا کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر پھر کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔

پچھلے دنوں کچھ خاندانوں نے مکانوں سے بے دخل ہونے کے بعد پارکوں میں خیمے لگائے اور رہنے لگے، مگر اب موسم گرما رخصت ہو رہا ہے اور یوں بھی پارک میں ہمیشہ کے لیے رہنے کی اجازت کبھی نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ اب یہ لوگ اپنے خیموں کو چھوڑ کر کہیں اور سر چُھپانے کی جگہ ڈھونڈنے پر مجبور ہیں۔ پہلے تو ان میں سے ہر خاندان یہی سمجھتا رہا کہ پڑوسی شاید چھٹی منانے کے لیے خیمہ زن ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ ایک دوسرے

پر یہ راز کُھل گیا کہ یہ بے گھر لوگ ہیں۔ ایک خاندان پانچ بچّوں اور ایک پوتے کے ساتھ ایک ۵ × ۵ کے خیمے میں رہتا تھا مگر اب انھیں یہ خیمہ بھی چھوڑنا ہوگا کیونکہ پارک اب بند ہو رہا ہے۔ ان میں سے ایک خاندان کے سربراہ ولیم نے بتایا کہ وہ لوگ گھر کے قرضے کی قسط ۳۶۶ ڈالر ماہانہ دیا کرتے تھے مگر اب وہ بڑھ کر ۶۰۰ ڈالر ہو گئی ہے جو ان کے بس سے باہر ہے۔ قسط ادا نہیں ہُوئی تو مکان سے نکال باہر کیا گیا اور وہ خیمے لگا کر رہنے لگے۔ دوسرے لوگوں کی داستان بھی ان سے مختلف نہیں ہے بہت سے لوگ "عارضی مکانوں" میں رہنے پر مجبور ہیں۔ خیال یہ ہے کہ مستقبل میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی ہی جائے گی ان میں کمی نہیں ہوگی۔ یہ خیال رہے کہ خیموں میں رہنے والے لوگ بے روزگار یا "غریب" نہیں ہیں۔ مگر ان کے لیے بڑھتے ہوئے قرضوں کا سود کی رقم ادا کرنا دوبھر ہو گیا ہے۔

ترقّی کی چمک دمک کی چکاچوند میں حقائق کس طرح چُھپ جاتے ہیں اس کے ثبوت میں ایک اور خبر بھی ملاحظہ فرمایئے جو کل ہی مقامی اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔

ٹورنٹو کے نواح میں پولیس کو کوڑے کے ایک ڈھیر سے ایک ۶۱ سالہ بوڑھے کی پسی ہوئی لاش دستیاب ہوئی ہے ہُوا یہ کہ ۶۱ سالہ مسٹر کیمپ کچھ عرصہ سے معاشی پریشانیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور اپنی پریشانیوں کو شراب کے جام میں ڈبونے کے عادی تھے۔ گزشتہ روز رات کا کھانا کھا کر وہ باہر نکلے۔ گھر ان کے پاس ہے نہیں اِس لیے پارک میں ایک بینچ پر بیٹھ کر شراب نوشی کرتے رہے اور پھر جب نیند آئی تو سونے کے لیے کوڑے کے ایک بڑے ڈبّے میں پڑ کر سو گئے۔ رات گئے کسی وقت کوڑا اُٹھانے والا ٹرک آیا اور اس نے ڈبوں کو اُٹھا کر ٹرک میں ڈال لیا۔ یہ ٹرک راہ چلتے ہی کوڑے کو پیس کر سُرمہ بنا دیتے ہیں چنانچہ مسٹر کیمپ کی موجودگی سے بے خبر ڈرائیور نے کوڑے کو پیسنے اور کُچلنے کا عمل شروع کر دیا۔ اور یوں مسٹر کیمپ کوڑے کے ڈھیر کے ساتھ ہی پس

گئے۔ گیہوں کے ساتھ گُن پسنے کا محاورہ تو ہمارے یہاں بھی عام ہے۔ مگر کوڑے کے ساتھ آدمیوں کا پس جانا مغربی ملکوں میں ہی ممکن ہے۔

کینیڈا کے محکمۂ اعداد و شمار نے جو اطلاعات فراہم کی ہیں ان کے پیشِ نظر اِس ملک کے بارے میں بعض نہایت دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً کینیڈا کا ایک عام شہری ۷۰ سال کی عمر پاتا ہے۔ ایک سال میں تقریباً ۱۹ گیلن شراب پی ڈالتا ہے۔ سال میں ۱۳ بار شادی کرتا ہے (یعنی ہر سال لوگوں کی اکثریت ایک سے زائد شادی کر ڈالتی ہے) ہر شخص ہر سال ۱۴ء۱ بچہ پیدا کرتا ہے۔ ایک عام کینیڈین شہری ہر سال ۸۷ پونڈ گوشت کھاتا ہے اور سال میں ۸۷۰ گھنٹے ٹی وی دیکھتا ہے۔

سڑکوں پر کاروں کے حادثات کثرت سے رُونما ہوتے ہیں اور ان میں باوجود احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً ٹورنٹو شہر کی حدود میں گزشتہ سال کاروں کے حادثات میں ۲۱ افراد ہلاک اور ۱۷۶۱ زخمی ہوتے۔ ٹریفک کے انتہائی مؤثر قوانین اور ان پر سختی سے عملدرآمد کے باوجود ٹریفک حادثات کی روک تھام ممکن نہیں ہے۔ ماہرین کافی تحقیق کے بعد اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سڑکوں پر حادثات کی وجہ "میکینیکل خرابی" سے زیادہ انسانی کوتاہی ہے۔ مثال کے طور پر کاروں کی خرابی کے باعث پیش آنے والے حادثات کا اوسط محض ساڑھے چار فیصد ہے۔ شراب نوشی کے سبب پیش آنے والے حادثات ۱۲ فیصد ہیں۔ کونیٹر یونیورسٹی کے محکمۂ تحقیق نے کہا ہے کہ باقی ماندہ حادثات ڈرائیور کی لاپرواہی یا کوتاہی کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ شراب پی کر کار چلانے والے کے خلاف تو قانون موجود ہے مگر کار چلاتے ہوتے ریڈیو کے بٹن مروڑنا، سگریٹ سُلگانا۔ یا اپنی بیوی یا شوہر کے ساتھ جھگڑا کرنا ایسے مسائل ہیں جن کے خلاف کوئی قانون موجود نہیں ہے۔

زیادہ تر حادثات کی وجہ گھریلو جھگڑے ہیں۔ شوہر بیوی سے لڑ کر کار میں بیٹھے

اور غصّے میں حادثہ کر بیٹھے یا بیوی شوہر سے جھگڑ کر نکلیں، کار میں سوار ہو کر روتی دھوتی جا رہی ہیں اور حادثہ کا شکار ہو گئیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ دوسری احتیاطی تدابیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ گھر سے جھگڑے کے بعد کار ڈرائیو نہ کریں۔

کینیڈا خصوصاً ٹورنٹو آ کر پتہ چلا کہ حادثات کا ایک بڑا سبب "پولیس" بھی ہے وہ "کس طرح"؟ ٹی وی کی مغربی فلموں یا ہالی وُڈ کی فلموں میں آپ نے دیکھا ہو کہ مجرم کوئی جُرم کر کے کار میں بھاگا ہے۔ اور پولیس سائرن بجاتی ہوئی اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ دونوں کاریں اندھا دُھند سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں۔ اور بعض اوقات فائرنگ کا تبادلہ بھی ہو رہا ہے۔ یہاں سڑکوں پر پولیس والے مجرموں کے پیچھے اسی طرح بے تحاشا کار دوڑاتے ہیں۔ کبھی کبھی گولیوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے مجرم کم اور راہ چلتے زیادہ ہلاک یا زخمی ہوتے ہیں۔ یا پھر پولیس کی، مجرموں کی یا سڑک پر جانے والے کسی شہری کی کار بے قابو ہو کر حادثہ کا شکار ہو جاتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کوئی کار والا تیز رفتاری کا مرتکب ہوا ہے اور پولیس کے ایک اشارے پر نہیں رُکا تو پولیس والے سائرن بجاتے ہوئے اس کے پیچھے کار دوڑانے لگتے ہیں۔ اور اس طرح کاروں کی اندھا دھند ریس شروع ہو جاتی ہے۔ پچھلے ایک سال میں دو سو سے زائد افراد محض اِس قسم کے واقعات کی وجہ سے حادثات کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ پولیس کی ایک ہزار سے زیادہ کاریں تعاقب کی وجہ سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اور تو اور بے گناہ راہ گیر حادثوں کا شکار ہو گئے۔ اخبارات لکھتے ہیں کہ محض ٹریفک کے اصول کی معمولی خلاف ورزی کی بنا پر پولیس والوں کو اس طرح کاریں نہیں دوڑانی چاہئیں۔ جس سے ناقابلِ بیان نقصان ہوتا ہے مگر پولیس کا کہنا ہے کہ صاحب قانون تو قانون ہے جو اس کی خلاف ورزی کرے گا ہم اسے کیونکر نظر انداز کر دیں؟

بھوت پریت کی کہانیاں مشرقی ملکوں میں تو عام ہیں۔ ہمارے ملکوں میں تعلیم یافتہ لوگ انھیں وہم یا جہالت یا ضعیف الاعتقادی کا نام دیتے ہیں۔ مگر یقین کیجئے کہ ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ مغربی ممالک میں بھی ایسے واقعات رُونما ہوجاتے ہیں۔ کل ہی کے اخبارات میں ایک قصبے "لی" کی خبر شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک خاتون ڈبل لیپٹؤان کے شوہر اور دو بچّوں کو "بھوت پریت" کی حرکتوں سے تنگ آکر اپنا گھر چھوڑنا پڑا ہے۔ بقول ان کے "بدروحوں" نے ان کے گھر پہ تسلّط جما لیا ہے اور گھر والوں کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ مجبور ہوکر انھوں نے گھر چھوڑ دیا۔ گزشتہ پانچ ماہ سے یہ کنبہ مسز لیپٹو کی ماں کے گھر ڈیرہ جمائے بیٹھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ بھوتوں نے گھر کا فرنیچر توڑ پھوڑ دیا۔ بستر اُلٹ پلٹ کر دیتے تھے۔ سامان میں آگ لگ جاتی تھی۔ چیزیں غائب ہوجاتی تھیں۔ کھانا یا تو غائب ہوجاتا تھا یا فرج میں کٹے ہوئے جانوروں کے خون آلود ٹکڑے پائے جاتے تھے۔ یہ محض ایک کہانی نہیں ہے۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ شمالی امریکہ میں اِس قسم کے تین ہزار واقعات رونما ہوچکے ہیں اور تین ہزار گھرانے "بھوتوں" کے ہاتھوں تنگ ہیں۔

مسز لیپٹو نے تو اپنے گھر کے موت کا نظارہ بھی کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے گھر کا بھوت ۵ فٹ ۹ انچ لمبا ہے، اس کے پیر بہت بڑے بڑے ہیں اور اس کی کمر میں کُبھ نکلا ہوا ہے، بھوت کی مہربانی یہ ہے کہ وہ بچّوں کو نہیں ستاتا، جب بچّے سو جاتے ہیں تو وہ مسز لیپٹو اور ان کے شوہر کے کمرے میں آکر انہیں تنگ کرتا ہے، بے ہودہ گندی باتیں کرتا ہے، خوفناک آوازیں نکالتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے۔ بھوت گھر کے سامان کو بھی پھینکتا رہتا ہے، ایک بار تو اس نے غصّہ میں آکر مسز لیپٹو پر حملہ بھی کر دیا، اور اپنے نوکیلے پنجوں سے انھیں لہولہان کر دیا، مسز لیپٹو کے پیٹ، کمر اور چھاتی پر زخموں کے نشان بھی موجود ہیں۔ اس کے شوہر دارن نے پہلے تو

سراغرسانوں کی مدد حاصل کی، جنھوں نے گھر میں چھُپ کر "بھوت" کا جائزہ لیا، اور یہ کہہ کر معذوری ظاہر کردی کہ وہ "بھوتوں" کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، ایک جاسوس نے بتایا کہ رات کو وہ جاگ ہی رہے تھے کہ تقریباً تین بجے ایک روشنی نمودار ہوئی جس کا قد تقریباً پانچ فٹ چار انچ تھا، روشنی آتے ہی کمرہ ٹھنڈا یخ ہوگیا، روشنی نے آتے ہی کمرے کا سامان پھینکنا شروع کر دیا اور پھر اس نے ایک سائے کی صورت اختیار کرلی اور پنجے اُٹھا کر مسز لیپٹو کی طرف بڑھا جو فوراً گھر سے باہر بھاگ گئیں۔ اب مسز لیپٹو اور ان کے شوہر نے "روحانی عاملوں" کی خدمات حاصل کی ہیں تاکہ وہ انھیں اِس بلا سے نجات دلاسکیں۔

۳۹ دن کی ہڑتال کے بعد، جس کے دوران چھوٹے موٹے کاروبار تباہ ہوگئے اور عام لوگوں کو ناقابلِ بیان پریشانیاں اُٹھانی پڑیں، کینیڈا میں ڈاک کی ہڑتال ختم ہوگئی ہے مگر لوگوں کا خیال ہے کہ عنقریب ہڑتالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہونے والا ہے جو عام لوگوں کی زندگیاں وبال کر دے گا۔ ٹی دی والے اور ملک کے ایک حصّے میں ٹیلیفون والے ہڑتال پر ہیں۔ ایک صوبے کے پولیس والوں نے ایک شہر کی نرسوں اور ڈاکٹروں نے ہڑتال کا نوٹس دے رکھا ہے، بیس دن سے زیادہ ہوگئے کہ صوبہ اونٹاریو میں "تھنڈر بے" کے مقام پر گندم جہازوں پر لادنے والے پندرہ سو مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی ہے جس کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ کاشت کاروں کی پیداوار جہازوں پر نہیں لادی جارہی اور اس ہڑتال کی وجہ سے ہر روز ایک کروڑ ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے، "تھنڈر بے" سے زیادہ تر گندم غیر ممالک کو درآمد کی جاتی ہے اور اگر کچھ عرصے اور یہ ہڑتال جاری رہی تو دوسرے ممالک کینیڈا کی جگہ دوسرے ممالک سے گندم خرید لیں گے جس کی وجہ سے ملکی کاشت کاروں کو بے پناہ نقصان ہوگا، اس ہڑتال کی وجہ سے جہاز بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور اب جہاز راں کمپنیوں نے اپنے عملے میں تخفیف کرنی شروع کر دی ہے۔

اِس پر ستم یہ ہے کہ اس موسم گرما میں یہاں معمول سے بہت زیادہ بارشیں ہوئیں، جس کی وجہ سے سبزیوں کو بہت نقصان پہنچا ہے، خیال ہے کہ آئندہ چند ہفتوں میں سبزیوں کی قیمتوں میں کافی اضافہ ہو جائے گا، کاشت کاروں کو نقصان ہو گا اور وہ معاشی بدحالی کا شکار ہوں گے تو اس کا اثر لازمی طور پر دوسری چیزوں پر بھی پڑے گا چونکہ کاشت کار اپنی آمدنی کا بیشتر حصّہ کھُلے دل سے خریداری اور آسائشوں کے حصول پر خرچ کرتے ہیں۔ اس طرح ملک کی ساری معیشت اس ہڑتال سے متاثر ہو گی۔ مگر فی الحال ہڑتال ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

پچھلے دنوں مقامی روزنامہ "ٹورنٹو اسٹار" نے جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے پیشِ نظر کینیڈا کی معیشت کا سرسری جائزہ یہ ہے:۔

ٹورنٹو کے تین میں سے دو شہریوں کا کہنا ہے کہ وہ بینک کی شرح سود میں اضافہ کی وجہ سے مشکل میں پڑ گئے ہیں، پچاس فیصد لوگوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے مکان خریدنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، تقریباً ایک تہائی آبادی کا کہنا ہے کہ مہنگائی کی وجہ سے انھوں نے اخراجات میں ۳۰ فیصد کمی کر دی ہے، آبادی کے چھٹے حصّے (۱۶ فیصد) کا کہنا ہے کہ ان کے قرضوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے اخراجات آمدنی سے زیادہ بڑھتے جا رہے ہیں، ۸۶ فیصد لوگوں کا کہنا ہے کہ تین چار ماہ قبل وہ معاشی حالات کی وجہ سے اتنے پریشان نہیں تھے جتنے کہ اب ہیں۔

۳۵ فیصد کرائے دار جن کی سالانہ آمدنی ۲۵ ہزار ڈالر ہے وہ مہنگائی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے قرضوں پر مکان خریدے ہیں ان میں سے ایک تہائی قرضے کی رقم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

یہ تو ہیں معاشی حالات، اب سماجی حالات کا بھی جائزہ لے لیجئے، نیو ہیمپشائر یونیورسٹی نے تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ گھریلو جھگڑوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور جن گھروں میں بیویاں

نوکری نہیں کرتیں یا بہت کم کماتی ہیں وہاں بیویوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق:۔

کینیڈا کی دس میں سے ایک بیوی اپنے شوہر سے مار کھاتی ہے، مگر بہت کم ہیں جو پولیس میں رپورٹ کرتی ہیں، جس کی وجہ سے ایسے شوہروں کا احتساب نہیں ہوتا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر بیویاں نوکری کر کے کمانے لگیں تب بھی حالات میں زیادہ تبدیلی نہیں ہو گی۔ اِس لیے ضروری ہے کہ قانون میں تبدیلی کی جائے۔ ایسی بیویاں گھروں کو چھوڑ کر کہاں جائیں۔ ماں باپ انھیں رکھنے سے قاصر ہیں۔ اگر اولاد بڑی ہے تو وہ بھی انھیں پناہ نہیں دیتی۔ امدادی اداروں میں محدود جگہ ہوتی ہے، اس پر ستم یہ ہے کہ جب تک کسی عورت کا کوئی گھر کا پتہ نہ ہو اسے حکومت سے رفاہی امداد بھی نہیں ملتی۔

یہ مغرب کی نہایت ترقّی یافتہ سوسائٹی کی انتہائی ترقّی یافتہ اور آزاد عورت کی تصویر ہے۔

ٹورنٹو

اِن دنوں ہم کینیڈا میں ہیں۔ آپ اس کو ٹورانٹو شہر کہہ سکتے ہیں لیکن ٹیکنیکل اعتبار سے یہ ایک دوسرا شہر ہے۔ سکاربورو، اِسے ٹورانٹو کا نواحی شہر کہہ لیجئے جیسے لاہور کا نواحی شہر گلبرگ ہے۔ آبادی اور خوشحالی کے اعتبار سے پہلے نمبر کا شہر ہے۔ جو لوگ سولہ سترہ سال پہلے یہاں آتے تھے ان کا بیان ہے کہ ان دنوں ہر طرف خاک اُڑا کرتی تھی۔ ٹورانٹو چھوٹا سا شہر تھا مگر اب یہ قابلِ دید شہر ہے جس پر کینیڈا کے لوگ فخر کرتے ہیں۔ یہ صوبہ اونٹاریو کا صدر مقام بھی ہے۔ آبادی اور پھیلاؤ کے اعتبار سے یہ ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کے باوجود آبادی ہمارے شہروں کے مقابلے میں بہت کم ہے یعنی صرف ۲۳ لاکھ کے لگ بھگ، فلک بوس عمارتوں اور عظیم الشان حسین بازاروں کے شہر کی اتنی مختصر سی آبادی ؟ ہمارا تو فیصل آباد بھی شاید اب اس کا حریف ہے (آبادی کے اعتبار سے) اس ملک کا صدر مقام اٹاوہ ہے۔ جس کی آبادی بمشکل پانچ چھ لاکھ ہو گی مگر نہایت خوبصورت شہر ہے۔ کچھ تو قدرتی جھیلوں اور سبزہ زاروں نے اس ملک کو حسین بنا دیا ہے۔ کچھ دستِ انسانی نے گُل بوٹے کھلائے ہیں اور اس ملک کو دُنیا کا خوبصورت ترین ملک قرار دیا جا سکتا ہے۔ شہر چھوٹے ہوں یا بڑے نہایت صاف شفاف اور حسین۔ کہتے ہیں کہ ٹورانٹو اور مانٹریال دُنیا کے صاف ترین شہر

ہیں۔ غلیظ ترین شہر کون سے ہیں ؟ ذرا بوجھیئے۔

مونٹریال کینیڈا کے صوبہ کیوبیک کا دارالحکومت ہے۔ کیوبیک میں فرانس کے لوگوں کی آبادی زیادہ ہے۔ اِس لیے شہر کے چلن، رکھ رکھاؤ اور مزاج میں فرانس کے لوگوں کا رنگ غالب ہے۔ زبان بھی یہاں سرکاری طور پر فرانسیسی ہے۔ فرانس والے انگریزی سے اللہ واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کیوبیک کے صوبے میں (انگریزوں کو تنگ کرنے کے لیے) یہ قانون بنا دیا کہ دفتری زبان تو خیر ہے ہی فرانسیسی۔ دکانوں وغیرہ کے بورڈ بھی محض فرانسیسی زبان میں لکھے جائیں۔ انگریزی نسل والوں نے اس پہ بہت احتجاج کیا۔ پچھلے دنوں ایک انگریز دکاندار نے ضد میں آکر اپنی دکان کا بورڈ انگریزی میں لکھا اور جب اس کا چالان کیا گیا تو اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ ایک شہری کی حیثیت سے یہ میرا حق ہے کہ مَیں اپنی دکان کا نام خواہ کسی بھی زبان میں لکھوں۔ کیوبیک کا صوبہ فرانس والوں کی اکثریت کا صوبہ ہے جو انگریزی زبان اور انگریزوں کو بالکل گھاس نہیں ڈالتے۔ ہر لحاظ سے خود سے کمتر سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے فرانس سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ روابط اور میل جول بھی فرانس کی حکومت سے زیادہ رکھتے ہیں۔ جب کہ کینیڈا کے دوسرے صوبوں کی آبادی میں اکثریت انگلستان والوں کی ہے۔ اگرچہ ہسپانوی، میکسیکن، اٹلی والے، یونانی اور دوسری نسلوں کے لوگ بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ چینی بھی کافی ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستان بھی سارے ملک میں ساٹھ ستر ہزار کے لگ بھگ تو ہوں گے۔ کینیڈا کافی عرصہ انگلستان کی نوآبادی رہا ہے اور کامن ویلتھ کا ممبر بھی ہے۔ اِس اعتبار سے یہ عجیب ملک ہے۔ رشتے ناطے انگلستان سے ہیں۔ زبانیں سرکاری طور پر دو ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی۔ مگر دوسرے تمام معاملات میں یہ ملک امریکہ کا نمونہ ہے۔ ہر چیز اسی انداز کی ہے۔ دوسری نسلوں کے لوگوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے مگر فرانس والے کچھ زیادہ ہی خود مختار بننا چاہتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب جنرل ڈیگال کے عہدِ اقتدار میں کیوبیک کے لوگوں نے یہ مہم بھی چلائی تھی کہ کیوبیک کا الحاق فرانس سے کر دیا جائے۔ جنرل ڈیگال نے کیوبیک کا دھواں دھار دورہ بھی کیا اور خوب گرجدار تقریریں کیں جن کی وجہ سے انگلستان سے فرانس کے تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے۔ بہرحال کیوبیک اور کینیڈا کے انگریز علاقوں کی لاگ ڈانٹ کسی طرح آج بھی کم نہیں ہوتی ہے۔ مونٹریال کیوبیک کے صوبے کا صدر مقام ہے۔ بہت خوبصورت اور قابلِ دید شہر ہے مگر مزاج اور ماحول بالکل فرانس جیسا ہے۔

مانٹریال میں اگر کوئی ملازمت کے سلسلے میں رہنا چاہے تو لازمی ہے کہ فرانسیسی زبان سے واقفیت رکھتا ہو ورنہ بہت مشکل ہوتی ہے۔ فرانس کے لوگ اپنی زبان اور کلچر کے معاملے میں سخت متعصب ہیں۔ خود فرانس میں یہ عالم ہے کہ پیرس جیسے بین الاقوامی شہر میں جو سیاحوں کا مرکز بھی ہے۔ فرانس والے جان بوجھ کر سیاحوں کے ساتھ انگریزی میں بات نہیں کرتے تاکہ وہ فرانس کی زبان سیکھیں۔ یہ زبانوں کا معاملہ بھی عجیب ہے امریکہ میں یوں تو دُنیا کی تمام نسلوں کے لوگ آباد ہیں مگر عملی طور پر ہسپانوی زبان انگریزی کے بعد امریکہ کی دوسری زبان ہے۔ جنوبی امریکہ، میکسیکو، اسپین وغیرہ کے لوگوں کی بہت بڑی آبادی ہے جو ہسپانوی زبان سیکھتے اور بولتے ہیں۔

پچھلے چند ہفتوں میں امریکہ اور کینیڈا میں ریکارڈ توڑنے والی گرمی پڑی۔ سو اور ایک سو تین درجہ حرارت ان ملکوں میں قیامت سے کم نہیں ہے۔ پچھلے ۹۴ سال کا ریکارڈ ٹوٹ گیا ہے۔ مسلسل دُھوپ اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصلیں خراب ہو گئیں۔ سبزہ زار سوکھ کر پیلے پڑ گئے۔ لوگوں کا یہ حال کہ پہلے تو خوش رہے مگر جب گرمی مسلسل پڑی تو العطش العطش پکارنے لگے۔ پنکھوں اور ایئر کنڈیشنروں کی خریداری شروع ہو گئی۔ ایک تو ویسے ہی یہاں کے لوگ کم سے کم لباس پہنتے ہیں (گرمیوں میں) مگر اِن دنوں تو اِنتہا ہو گئی۔ اخباروں نے عورتوں اور مردوں کی تقریباً برہنہ تصویریں شائع کرنا شروع کر دیں۔ بعض کالم نگاروں نے شور مچا

دیا کہ صاحب یہ کیا اندھیر ہے؟ کہیں تو کوئی حد قائم ہونی چاہیئے۔ راہ چلتے لوگ اور کاروں والے کیونکر اپنی توجہ ٹریفک پر مرکوز کریں! حقیقت بھی یہ ہے کہ عریانی تو پہلے بھی یہاں بہت دیکھی مگر اب تو یوں لگتا ہے جیسے خواتین وحضرات کپڑے کا تکلف ہی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ایک زنانہ لباس تو وہ ہوتا ہے جو اتنا باریک ہوتا ہے کہ لباس ہی نہیں ہوتا اور اس کے اندر انسانی جسم کے علاوہ کوئی دوسرا جامہ نظر آتا نہیں آتا لیکن دوسرا لباس بھی ایجاد ہو گیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک اخبار نے چند خواتین کی تصویریں شائع کیں جن کے جسموں پر بلا مبالغہ سب ملا کر تین انچ لباس بھی نہ ہو گا۔ باریک سی ڈوریاں سمجھ لیجئے اور اتنی اتنی نازک اور برائے نام کہ اگر جھٹکا ماریں تو ڈوریاں ٹوٹ جائیں یا لباس کی یہ تہمت ہی غائب ہو جائے۔ اتفاق سے اسی روز ٹورانٹو کے سینٹر آئی لینڈ میں پرویز ملک کی فلم "کامیابی" کی شوٹنگ تھی اور ہم لوگ بھی گئے ہوتے تھے۔ یہ جگہ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہاں خواتین نہایت بے فکری اور بے پروائی سے اپنے چند انچی لباس میں گھومتی پھر رہی تھیں۔ پرویز صاحب اور عکاس ریاض بخاری کو یہ مشکل پڑ گئی کہ شوٹنگ کے لیے کون سے زاویئے اپنائیں اور عریانی اور برہنگی سے فلم کے فریم کو کیسے بچائیں۔ یہ بھی ایک ہرکولین کام تھا۔ شبنم، ندیم، ننھے اداکار خرّم کے علاوہ مقامی اداکاروں نے بھی شوٹنگ میں حصّہ لیا۔ جن میں چند سفید فام کینیڈین لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ واجد، اعظم گاندھی کے ساتھ ساتھ کینیڈا کی ایک دوشیزہ صبا بھی اس فلم میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ مزاحیہ اداکار ننھا بھی پچھلے دنوں یہاں پہنچ گئے اور فلم بندی میں حصّہ لے رہے ہیں۔ اِس فلم میں وہ ایک پٹھان کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

اداکار ننھے ٹورانٹو پہنچے تو ان کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور ان کے استقبال کے لیے ایک کار اور چند حضرات استقبالیہ کمیٹی کے طور پر ایئر پورٹ گئے تھے مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ خیر مقدم کرنے والوں کی کار ٹریفک کے ہجوم میں پھنس گئی اور وہ کچھ لیٹ ہو گئے۔

ادھر ننھا صاحب کا جہاز کچھ پہلے آگیا۔ ان کے بھانجے وغیرہ انھیں لینے گئے ہوتے تھے۔ وہ انھیں لے کر اپنے گھر چلے گئے اب استقبالیہ کمیٹی نے انتظار شروع کر دیا اور جب فلائٹ کا آخری مسافر بھی ایئر پورٹ سے روانہ ہو گیا تو ایئر پورٹ والوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ انھوں نے بتایا کہ لندن کی فلائیٹ سے کوئی ایشیاتی نہیں آیا اور نہ اس نام کے کسی مسافر نے سفر کیا ہے۔ سب لوگ صبر کا گھونٹ پی کر واپس آگئے۔ رات گئے ننھا صاحب کا فون آیا۔ پوچھا۔

"ارے بھئی کہاں سے بول رہے ہیں؟"

بولے "ٹورانٹو سے"۔

سب بہت حیران ہوئے۔ دریافت کیا کہ آپ تو ایئر پورٹ پر نظر ہی نہیں آئے۔ اس بات پر وہ ناراض ہو گئے۔ بولے۔

"اجی میں کوئی چڑیا کا بچہ ہوں جو نظر نہیں آیا"

انھوں نے بتایا کہ وہ کُرتہ قمیض پہن کر آئے تھے اور حیرت ہے کہ اس کے باوجود ایئر پورٹ والوں نے انھیں پہچانا نہیں سمجھا۔ بہرحال ننھا بے چارے کو دم لینے کی بھی فرصت نہ ملی۔ دوسرے ہی روز وہ ایک شاپنگ سینٹر میں "کامیابی" کی فلم بندی میں حصّہ لے رہے تھے۔ یہ ایک مصروف ترین شاپنگ سینٹر ہے۔ منظر یہ تھا کہ ننھا صاحب اپنے پوتے کے ساتھ گئے ہوتے ہیں۔ انھیں پاکستان سے کینیڈا آتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور یوں بھی یہ خالص پٹھان ہیں۔ دوسری طرف ان کے بیٹے نے جو کئی سال سے کینیڈا میں رہتا ہے ایک کینیڈین خاتون سے شادی کر رکھی ہے اور ان دونوں کا ایک سات آٹھ سال کا بچہ بھی ہے۔ منظر یہ ہے کہ پوتا دادا سے خالص امریکی لہجہ میں بات کر رہا ہے، اور دادا پشتو آمیز پٹھانی اُردو میں گفتگو کر رہے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں پاتے۔ اتفاق سے ندیم کا اس طرف سے گزر ہوتا ہے تو وہ دادا اور پوتے

کو ایک دوسرے کی گفتگو کا ترجمہ کر کے سُناتے ہیں۔ دادا اِس بات پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کا پوتا ان سے "فرنگی کا زبان میں بات کرتا ہے"۔ خوچہ تم نہیں جانتا کہ اُم کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟ مگر پوتا نہ ان کے قبیلے کو جانتا ہے نہ ان کی زبان سے واقف ہے۔ وہ ندیم سے کہتے ہیں۔ "خوچہ اُم کیا بتلائے خان اِدھر امارا تو نسل کا خانہ خراب ہو گیا"۔

اِس منظر پر ننھے اداکار خرم اور نئے کمسن اداکار شان نے بھی اداکاری کی۔ یہ واقعہ تو آپ نے فلم کے ایک سین کا سُنا۔ اب فلم سے باہر کا ایک واقعہ بھی سُن لیجئے۔ ہوا یہ کہ ہم سب لوگ جس بیس منزلہ اپارٹمنٹ میں مقیم ہیں اس کا مینجر بھی کسی زمانے میں ٹی وی سے متعلق رہا ہے اور فلموں سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ چنانچہ فلم کے رشتے سے "کامیابی" کے یونٹ سے گھُل مل گیا۔ عکّاس ریاض بخاری اس کے ہنسی مذاق اور شگفتہ مزاجی سے اتنے متاثر ہوتے کہ اسے فوراً دعوت دے ڈالی کہ آج شام آپ میرے مہمان ہیں۔ وہ بیچارہ خالص کینیڈین۔ گورے لوگ تو اپنے ماں باپ کو سال دو سال کے بعد کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ کہاں یہ کہ پہلی ملاقات میں کوئی مدعو کر لے۔ یہ مشرقی مہمان نوازی کے طریقے ہیں۔ مینجر صاحب بڑے حیران ہوتے۔ بڑی مشکل سے پرویز ملک نے شستہ انگریزی میں انھیں ریاض بخاری کا دعوت نامہ سُنایا اور ان سے ریاض بخاری کا تفصیلی تعارف بھی کرایا۔ مینجر صاحب بہت خوش ہوتے۔ اب ہوا یہ کہ جوش میں آکر ریاض بخاری انگریز مینجر کو دعوت تو دے بیٹھے۔ مگر جب ہوش سے سوچا تو خیال گزرا کہ اس کی گاڑھی انگریزی کے ساتھ گزارہ کیسے ہوگا۔ چنانچہ طفیلیوں کے طور پر انھوں نے ہمیں اور چند دوسرے انگریزی دان حضرات کو بھی مدعو کر لیا۔

ٹھیک وقت مقررہ پر مینجر صاحب ریاض بخاری کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے۔ ریاض بخاری اور دوسرے استقبالی پہلے ہی نہا دھو کر فریش ہو گئے تھے اور ان کے منتظر

تھے۔ اب گفتگو کا آغاز ہُوا۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ مینجر صاحب نہایت گاڑھی اور مشکل امریکی لہجے میں انگریزی بول رہے تھے۔ ریاض بخاری نے پنجابی لہجے میں انگریزی بولنا شروع کی تو مینجر کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے دعوت پر بُلانے کے لیے ریاض بخاری کا دلی شکریہ اَدا کیا۔ بخاری صاحب نے اِس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آپ تو میرے انکل ہیں۔ وہ ایک لفظ بھی نہ سمجھا حالانکہ ریاض بخاری نے انگریزی میں فقرہ اَدا کیا تھا۔ مینجر نے ہماری طرف دیکھا اور انگریزی میں پوچھا۔

"یہ کیا کہتے ہیں؟"

ہم نے ان کو بتایا کہ یہ کہتے ہیں کہ "آپ میرے انکل ہیں"۔ اِس کے بعد بات چیت کا یہ انداز ہو گیا کہ مینجر صاحب انگریزی میں ایک فقرہ بولتے جس کا اُردو ترجمہ ہم ریاض بخاری کو سُناتے۔ وہ ٹھیٹ پنجابی لہجے میں انگریزی بولتے اور ہماری طرف دیکھتے اور ہم ان کی انگریزی کا انگریزی میں ترجمہ کرتے۔ دراصل ریاض بخاری اب جان گئے تھے کہ مینجر صاحب ان کی انگریزی نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اِس بات پر انھوں نے بہت حیرانی ظاہر کی اور کہنے لگے۔ "یہ کیسا انگریز ہے کہ انگریزی نہیں سمجھتا۔ آغا صاحب اس کو بتائیں کہ مَیں نے ایسا انگریز پہلے نہیں دیکھا"۔ چنانچہ ہم نے ان کا یہ تعریفی جملہ مینجر صاحب کو سُنا دیا۔ وہ بہت خوش ہوتے اور بولے۔ "ہم نے بھی کبھی فرسٹ کلاس کیمرہ مین کے ساتھ بیٹھ کر دعوت نہیں کھائی"۔ یہ کہہ کر اس نے ریاض بخاری کا کندھا تھپکا۔ بخاری صاحب پوچھنے لگے۔ "گورا کیا کہہ رہا ہے؟" ہم نے فوراً مترجم کے فرائض اَدا کیے۔ اور ریاض بخاری خوشی سے بے قابو ہو گئے۔ ایک گھنٹے تک تو ہم انگریزی سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کا فرض اَدا کرتے رہے مگر پھر ہمت جواب دے گئی اور ہم نے میزبان اور مہمان دونوں سے رُخصت کی اجازت طلب کی۔ اس وقت تک کافی عرصہ گزر چُکا تھا اگرچہ دونوں کی انگریزی اب بھی ایک دوسرے کے لیے ناقابلِ فہم تھی مگر بے تکلفی

کا ماحول پیدا ہو چکا تھا چنانچہ ہمیں رُخصت کی اجازت دے دی گئی اور ہم چلے آئے۔ اگلے دن سُنا کہ دونوں حضرات رات گئے تک ایک دوسرے کے ساتھ انگریزی بولتے رہے۔ اگر مسٹر چرچل زندہ ہوتے تو ہم یہ تاریخی واقعہ ان کے علم میں لاتے اور وہ شاید اس کو بھی اپنی انگریزی زبان کی تاریخ میں شامل کر دیتے کیونکہ شاید تاریخ میں پہلا موقع تھا جب دو آدمی انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے اور ایک تیسرا شخص اُن کی انگریزی کا ترجمہ کر رہا تھا۔

پڑیئے جو بیمار ...

وطنِ عزیز کے ہسپتالوں کی حالت کے بارے میں ہم سب ہی جانتے ہیں۔ ہم سب کا واسطہ آئے دن اپنے مُلک کے ہسپتالوں سے پڑتا ہے۔ کون ہے جو اِن کے تغافل کا شکار نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی خوش نصیب ایسا ہوگا جسے کبھی ہسپتال جانے کی ضرورت نہ پڑی ہو۔ جو خود ہسپتال جانے سے محفوظ رہتے ہیں۔ وہ ہر روز اخبارات میں ہسپتالوں کے بارے میں پڑھتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب عام تاثر یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو اِس دعائیہ کلمے سے نوازتے ہیں۔ خدا آپ کو تھانے، عدالت اور ہسپتال کا مُنہ نہ دکھائے۔ اور کسی بھی شریف آدمی کے لیے یہ نہایت ضروری دعا ہے۔

پچھلے دنوں ہم کینیڈا گئے، پہلے بھی جا چکے ہیں مگر اِس بار اتفاق سے بیمار پڑ گئے، معمولی سا بخار تھا۔ ۹۹ بھی نہ ہوگا۔ ہماری اپنی تشخیص یہ تھی کہ گلا خراب ہے۔ اور یہ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھی۔ ہر چھ ماہ کے بعد ہمارے گلے میں "جراثیمی نشوونما" ہو جاتی ہے اور بخار میں مبتلا ہو کر ہم ڈاکٹر کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ جواب لگا بندھا ہے۔ "گلے میں انفیکشن ہو گیا ہے، اینٹی بائیوٹک لینی ہوگی"۔ شروع شروع میں ہم بہت شور مچاتے تھے۔ فریاد کرتے تھے کہ خدارا ہمیں اینٹی بائیوٹک نہ دیجئے۔ کسی اور دوائی سے علاج کر دیجئے۔ مگر جواب صرف ایک ہوتا ہے۔ "یہ ضروری ہے ورنہ انفیکشن پھیل

جائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب ہمارے لیے مائی سین تجویز کر دیتے اور چند روز لوٹ پوٹ ہونے کے بعد ہم بخار سے نجات حاصل کر لیا کرتے۔ اب تو یہ معمول "حسبِ معمول" میں داخل ہو چکا ہے۔ ہمیں وہ دوائیں بھی ازبر یاد ہو گئی ہیں جو ہمیں مختلف ڈاکٹر صاحبان تجویز فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر چاہے کتنے ہی مختلف ہوں۔ دوائیوں میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک بار جب ہم کولمبو کے دوران قیام گلے کی خرابی کے سبب بخار میں مبتلا ہو کر ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے تو کولمبوی ڈاکٹر نے بھی وہی دوائی تجویز کی۔ ہم نے بہتیرا کہا کہ کوئی اور علاج کر دیجئے مگر انھوں نے ہمیں بڑے غور اور ہمدردی سے دیکھا اور بولے۔

"دیکھئے مسٹر۔ آپ پردیس میں ہیں، اپنے گھر سے دُور ہیں ہوٹل میں پڑے ہوتے ہیں۔ ہیں کہ نہیں؟"

ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کہنے لگے۔

"اِس لیے ضروری ہے کہ آپ جلدی تندرست ہو کر اپنا کام کاج کریں اور جتنی جلدی ممکن ہو واپس گھر چلے جائیں ہے کہ نہیں؟"

ہم نے پھر سر ہلایا اور انھوں نے بھی ہمارے لیے وہی مائی سین تجویز کی جو ہمارے پاکستانی ڈاکٹر ہمیں کھلاتے رہے ہیں۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہی دوائی کھا کر ہم ایک ہفتے بعد تندرست ہو گئے۔ بخار تو اُتر گیا مگر کمزوری اتنی ہو گئی کہ بستر سے اُٹھے تو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور بتایا کہ ہاتھ پیر بے جان ہیں۔ بھوک غائب ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ نیند نہیں آتی۔ جواب میں وہ مسکراتے اور بولے۔ "مائی سین، یہ سب مائی سین کے اثرات ہیں۔ اس کا بھی علاج کر دیں گے۔ ہے کہ نہیں؟" اس کے بعد وہ مائی سین کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے علاج کے لیے دوائیاں تجویز کرنے لگے۔ اس تجربے کے بعد ہم نے یہ سبق

حاصل کیا کہ گھر سے سفر پر نکلتے ہوتے وہ ماتی سین ضرور اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیتے ہیں جس کا نام ہمیں زبانی یاد ہو چکا ہے مگر اس بار غلطی یہ ہوتی کہ ہم نے سوچا کینیڈا۔ امریکہ اور انگلستان جا کر گلا کیا خراب ہوگا۔ چنانچہ اس غلط فہمی کی وجہ سے ہم نے وہ ماتی سین اپنے ساتھ نہیں رکھی اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ٹورنٹو پہنچ کر ہمارے گلے کے جراثیم صحت افزا خوراک اور آب و ہوا کی وجہ سے ہم سے زیادہ نشوونما پا گئے اور ہم بیمار ہو گئے۔

کینیڈا اور امریکہ میں بیمار پڑنا بہت بڑی غلطی بلکہ انتہائی مہنگی حماقت ہے۔ مگر گاہک اور بیماری کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کب نازل ہو جاتے۔ لہٰذا جب ہمارے ٹمپریچر کو دو دن گزر گئے تو ہمارے دوستوں نے مشورہ دینا شروع کیا کہ بھائی ڈاکٹر کو جا کر دکھاؤ۔ ہم نے اپنی ہیلتھ انشورنس بھی خریدی ہوتی تھی اس لیے سوچا کہ کیوں نہ اس سہولت سے فائدہ اٹھایا جائے اور انشورنس کمپنی کے خرچ پر اپنا علاج کرائیں۔ ہدایت کار پرویز ملک کو بھی یہ تجویز پسند آئی اور ان کے پُراصرار پر ہم اپنے ایک کینیڈین دوست کی کار میں سوار ہو کر سُوتے ہسپتال روانہ ہو گئے۔

ہم ان دنوں ٹورنٹو کے نواحی شہر مارکھم میں مقیم تھے۔ یہ سکاربورو کے علاقے میں واقع ہے جس ہسپتال کا ہم نے رُخ کیا اس کا نام بھی سکاربورو سینٹی نیری ہسپتال ہے اب یہ سنیئے کہ اس ہسپتال میں ہم پر کیا گزری۔

ایک کئی منزلہ خوبصورت عمارت خوشنما سبزہ زار اور باغوں کے درمیان گھری ہوتی۔ سامنے پارکنگ لاٹ میں بے شمار کاریں کھڑی ہوتیں۔ ہم سمجھے کسی فائیو سٹار ہوٹل میں آ گئے ہیں۔ مگر یہ ہسپتال تھا۔ ہمارے دوست واجد صاحب نے ایک لمبا چکر کاٹا اور کار کو ایک بڑے پارکنگ لاٹ میں کھڑا کر دیا۔ ہم نے مرعوب ہو کر مشکوک انداز میں پوچھا۔

"یہ ہسپتال ہی ہے نا؟"

"سوفیصد" یہ کہہ کر وہ ہمیں صاف شفاف سیڑھیوں سے چڑھا کر ایک نہایت ہی مصفّا اور پُرآرائش لابی میں لے گئے۔ سامنے استقبالی کاؤنٹر تھا۔ جس پر دو ہنس مُکھ خوش اندام خواتین سفید سکرٹ میں ملبوس بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ ہم قریب گئے تو دانت اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔ ہم سوچنے لگے کہ ہم ان سے پہلے کہاں ملے ہیں جو اتنی گرمجوشی سے ہمارا خیر مقدم ہو رہا ہے۔ ہم ان کی مسکراہٹ کے نشے میں چُور دریافت کرنے ہی والے تھے کہ مس ہم آپ سے پہلے کہاں ملے تھے؟ کہ واجد صاحب نے یہ کہہ کر چونکا دیا "اپنا انشورنس کارڈ نکال کر دیجئے۔" کارڈ دیکھ کر بھی ہماری میزبان کی مسکراہٹ میں کمی نہ آئی۔ انھوں نے جھٹ پٹ ایک فارم پُر کیا اور ہمارے آٹوگراف حاصل کرنے کے لیے سامنے رکھ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک دو کمپیوٹر مشینوں میں اس کارڈ اور فارم کو ڈالا اور چند لمحے بعد فارم ہمارے حوالے کرتے ہوتے دلفریب انداز میں مُسکرا کر بولیں۔ "سامنے تشریف لے جائیے۔ دائیں ہاتھ کو ہولڈنگ روم ہے۔ وہاں ایک اور میزبان ملیں گی۔ خدا حافظ اپنا خیال رکھنا۔" اتنی پُرخلوص اور محبت بھری گفتگو تو ہماری رشتہ دار خواتین نے ہمیں پاکستان سے رُخصت کرتے ہوتے بھی نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم بہت متاثر ہوتے اور "ہولڈنگ روم" کی طرف چل پڑے۔ ماحول انتہائی خوبصورت، کیا مجال جو کسی دوائی حتیٰ کہ فینائل تک کی بدبو آ جاتے۔ مگر صفائی ایسی کہ فرش سے چھت تک (اور درمیان میں بھی) ہر چیز شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

ہولڈنگ روم ایک بڑا سا ہال تھا۔ سامنے ایک میز پر ایک اور خوش مزاج خاتون تشریف فرما تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل گئیں اور انھوں نے مُسکرا کر ہماری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہم نے بھی فرطِ خلوص سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر وہ مسکرا کر بولیں۔ "کارڈ دیجئے۔" واجد صاحب نے بھی ہمیں ٹہوکا مارا تو احساس ہُوا کہ دراصل انھوں نے کارڈ طلب کیا تھا ہمارا ہاتھ نہیں۔ بہرحال کیا مضائقہ ہے۔ نہ انھوں

مانڈ کیا نہ ہم نے کارڈ دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی اُٹھیں اور بولیں "میرے ساتھ آیئے"۔ ہم ان کی دلکش چال کو سراہتے ہوئے پیچھے چل پڑے مگر وہ چند قدم چل کر رُک گئیں۔ ایک صاف سُتھرے بیڈ کے نزدیک پہنچ کر انھوں نے ہاتھ اونچا کیا اور ایک سفید پردہ کھینچا تو ہمارے اردگرد پردے کی دیوار بن گئی اور ایک علیٰحدہ کمرہ بن گیا۔ انھوں نے کہا "آرام کیجیے" اور چلی گئیں۔ ہم نے واجد صاحب کی طرف دیکھا وہ بولے۔ "تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آپ کو دیکھے گا۔ مَیں رخصت ہوتا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد باہر لابی میں آپ کو ملوں گا۔"

ان کے جانے کے بعد ہم سوچنے لگے کہ بستر پر لیٹیں یا کُرسی پر بیٹھیں کہ پردہ اُٹھا کر ایک اور خاتون اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں ہلکے نیلے رنگ کا ایک گاؤن تھا جو ریشمی محسوس ہوتا تھا۔ گاؤن انھوں نے ہماری طرف بڑھایا اور تبسّم کیا۔ ہم بھی اخلاقاً مُسکراتے تو بولیں۔ "یہ پہن لیجیے"۔ ہم نے پوچھا "کیا جوتے اُتار دیں؟" بولیں "جوتے ہی نہیں سارے کپڑے" ہم نے حیران ہو کر پوچھا کہ بھلا گلے کی خرابی سے کپڑے اُتارنے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ بولیں "جلدی کیجیے۔ ڈاکٹر آتے ہوں گے"۔ اب ہم منتظر کہ وہ رُخصت ہوں تو ہم لباس تبدیل کر لیں مگر وہ جانے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ ہم نے جوتے کے فیتے کھولنے میں پانچ منٹ لگا دیئے تو وہ شاید ہماری سُست رفتاری سے اُکتا کر رخصت ہو گئیں۔ ہم نے جھٹ پٹ لباس اُتارا اور ریشمی گاؤن پہن کر بستر پر دراز ہو گئے اور سوچنے لگے کہ خدایا ہم تو اسپتال کے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں آتے تھے مگر یہاں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔

یکایک پردہ اُٹھا اور اس بار ایک دوسری خاتون ایک چھوٹی سی ریڑھی لیے ہوئے آئیں۔ مسکرا کر انھوں نے "ہائی" کہا اور ریڑھی میں سے ایک تھرمامیٹر نکال کر ہمارے مُنہ میں ٹھونس دیا۔ اسی ریڑھی میں ایک بلڈ پریشر چیک کرنے والا آلہ بھی نصب تھا۔ انھوں نے گاؤن کی آستین اُٹھا کر ہمارا بلڈ پریشر چیک کرنا شروع کر دیا۔ اس تمام کارروائی کے

دوران وہ خاموش رہیں مگر ہمیں دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہی تھیں۔ ہم بھی مجبوراً مسکراتے رہے۔ بلڈ پریشر اور تھرمامیٹر دیکھنے کے بعد انھوں نے اسی ریڑھی میں لگی ہوئی ایک نوٹ بک پر کچھ لکھا اور ریڑھی کھینچتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔ ہم بستر پر دراز ہو کر اس کارروائی پر غور کرنے لگے۔ چند لمحے بعد ایک اور مس اندر آئیں مگر وہ سادہ لباس میں تھیں یعنی ڈاکٹر تھیں۔ وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔ علیک سلیک کے بعد انھوں نے ہماری زبان، ناک، کان، گلا سینہ، کمر اور ہاتھ پیروں کا معائنہ کیا اور آخر میں مسکرا کر بولیں "انتظار کیجیے، ڈاکٹر بھی آتے ہیں" اور چلی گئیں۔

اب ہمیں پریشانی ہو گئی کہ یہ تو کوئی لمبا قصّہ معلوم ہوتا ہے۔ یکایک تیز قدموں سے کوئی ہال میں داخل ہُوا اور ہمیں برابر والے پردے کے کمرے سے ایک مردانہ آواز آئی۔ "ہیلو، میرا نام فلو ہے۔ آپ کا کیا حال ہے؟" جواب میں ایک محترمہ نے انھیں اپنا حال بتانا شروع کیا تو ہمیں احساس ہُوا کہ ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے ہیں۔ مگر ان کے نام پر ہمیں حیرت ہوئی۔ چند منٹ وہ مصروف رہے اور ان کی آوازیں ہمیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر انھوں نے مریضہ سے کچھ کہا۔ خدا حافظ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے ہمارے پردے کی طرف آئے۔ اب ہم کو ایمرجنسی میں آتے ہوئے نصف گھنٹہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور ہم ڈاکٹر کی آمد کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ پردہ ہٹا اور ایک درمیانی عمر کا ہنس مُکھ آدمی اندر داخل ہوا۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر عینک اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ بولے۔ "ہیلو، میرا نام فلو ہے۔ آپ کا کیا حال ہے؟" ہم نے فوراً اپنے گلے اور ہلکے سے ٹمپریچر کا احوال سُنا دیا۔ انھوں نے ہماری نبض پر ہاتھ رکھا۔ آنکھیں، گلا کان، ناک اور سینہ دیکھا اور پھر کہنے لگے۔ "بہت ہلکا ٹمپریچر ہے۔ مگر اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے کچھ ٹیسٹ لینے پڑیں گے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے چھ سات قسم کے ٹیسٹ گِنوا دیئے۔

"اس میں کتنا وقت لگے گا؟" ہم نے پوچھا۔

"کم سے کم چار پانچ دن آپ کو اسپتال میں رہنا ہوگا۔"

ہم گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ "مگر ڈاکٹر یہ تو معمولی سی حرارت ہے۔"

"مگر ہم مکمل چیک اَپ کے بغیر آپ کو جانے نہیں دیں گے۔"

"دیکھئے ڈاکٹر! مجھے معلوم نہیں تھا کہ اِتنا لمبا قصہ ہے۔ میرا دو بجے اپائنٹ منٹ ہے۔"

"کیا آپ بہتر محسوس کر رہے ہیں؟"

"جی بہت زیادہ۔"

"تو پھر ٹھیک ہے آپ جائیے۔ اگر طبیعت میں گرانی محسوس ہو تو کل یا آج شام آ جائیے۔ میرا نام فُلو ہے۔ اگر مَیں نہ ہوا تو کوئی اور ڈاکٹر ہوگا۔ مگر بہتر ہوتا ہے کہ آپ رُک جاتے۔"

"ڈاکٹر، مجھے بہت سے کام ہیں۔ وقت کم ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مُسکراتے۔ "پھر آجائیے گا۔ آپ ہندوستانی ہیں؟"

"جی نہیں۔ پاکستانی۔"

"کراچی یا لاہور؟"

"لاہور۔"

"بیوٹی فل سٹی۔ مگر مَیں نے نہیں دیکھا۔ مَیں ہندوستان میں نو سال رہا ہوں۔"

اس کے بعد انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے بارے میں سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ کچھ ثقافت کے بارے میں، کچھ سیاست کے بارے میں پوچھا اور پھر ہمارا شانہ تھپک کر بولے۔

"اچھا خدا حافظ، خدا کرے آپ کو دوبارہ آنے کی ضرورت نہ پڑے۔

"مگر ڈاکٹر گلے کے لیے کوئی دوا یا ماتی سین . . . "

"ماتی سین بلاضرورت نہیں دی جاتی مسٹر آفاقی۔ اور آپ کا چیک اَپ کرنے کے بعد ہی بخار کا سبب معلوم ہو سکتا ہے۔ مَیں تو کہتا ہوں آپ رُک جائیے۔ دُنیا کے کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔" وہ اتنے خلوص اور محبت سے روک رہے تھے جیسے کوئی دوست یا رشتے دار اپنے مہمان کو روکتا ہے۔ مگر ہمارے پاس کام بہت زیادہ تھے اور وقت کم۔ اِس لیے معذرت چاہی۔ ابھی وہ رخصت نہیں ہوتے تھے کہ واجد صاحب گھبراتے ہوتے آتے۔ "بھئی کیا ہو گیا۔ مَیں کب سے باہر انتظار کر رہا ہوں۔ خیر تو ہے؟"

ڈاکٹر فلو مُسکراتے اور بولے۔ "اردو؟"

ہم نے کہا۔ "جی ہاں۔"

کہنے لگے۔ "اچھی زبان ہے، اچھا خدا حافظ۔ ضرورت ہو تو جب چاہے آجانا۔"

یہ کہہ کر وہ رُخصت ہوتے اور ہم جھٹ پٹ لباس تبدیل کر کے واجد صاحب کے ساتھ آ گئے۔ ہماری حرارت دو تین بعد رُخصت ہو گئی۔ مگر کینیڈا کے ہسپتال میں ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں گزرے ہوئے دن ہم شاید کبھی نہ بھُول سکیں گے۔ ہم سوچتے ہیں کہ جب معمولی حرارت کے مریضوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے تو سنگین نوعیت کے مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے کیا کچھ کیا جاتا ہوگا؟

یہ تو تھا کینیڈا کے ہسپتال کا احوال۔ اب انگلستان کی سُنیئے۔ اِس واقعہ کے چند ہفتے بعد ہم لندن پہنچے تو ایک اخبار میں رپورٹ پڑھی کہ انگلستان کے ضلعی ہسپتالوں کی حالت بہت پتلی ہے۔ مریضوں کے لیے کمروں کی اتنی کمی ہے کہ انھیں برآمدوں میں رکھا جاتا ہے اور بستروں کی کمی کی وجہ سے ان میں سے بہت سے مریضوں کو واپس بھی کر دیا جاتا ہے۔ ادھر حکومت کی طرف سے بچت کی مہمیں چلائی جا رہی ہیں مثلاً ضلع لیورپول میں ۶۷ لاکھ پونڈ بجٹ میں سے کم کر دیئے گئے ہیں جس کی وجہ سے ہسپتالوں میں سہولتیں اور کم ہو جائیں گی۔ جب "سنڈے ٹائمز" نے اس بارے میں رپورٹ شائع کی تو رائل لیورپول ہسپتال

کے منتظم نے اگلی بار اخبار کے نمائندے کو ہسپتال میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی، اور اب ہسپتال کے ایکسیڈنٹ اور ایمرجنسی کے شعبوں میں اخبار والوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اخبار نے لکھا تھا کہ بستروں کے اس ہسپتال میں مریضوں کے داخلہ کا طریقہ کار انتہائی ناقص ہے۔ ڈاکٹروں کے مابین چپقلش اور کشمکش بہت زیادہ ہے اور بہت سے ڈاکٹر محض بستروں پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کے لیے مریضوں کو ہسپتال سے چھٹی نہیں دیتے ۱۹۸۱ء میں ایک ہسپتال کے بارے میں یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ جگہ کی کمی کے باعث کئی مریضوں کو دن کے اوقات میں کرسیوں پر بٹھا دیا جاتا ہے اور ان کے بستر سرجری کے مریضوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ نرسوں پر کام کا بوجھ ہے۔ اس پر مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومت اخراجات کم کرنے کی غرض سے اگلے سال بجٹ میں مزید بارہ لاکھ پونڈ کی کمی کر دے گی۔

نئی دُنیا اور پُرانی دُنیا کا یہ فرق محض ہسپتالوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ (کینیڈا) کے درمیان وہی فرق ہے جو ایک غریب آدمی اور اس کے امیر رشتے دار میں ہوتا ہے اور یہ احساس زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما نظر آتا ہے۔

شکایتیں، حکایتیں!

کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں بھی لوگوں کو وہی شکایت ہے جو لاہور اور کراچی کے لوگوں کو ہے یعنی موسم عجیب ہو گئے ہیں۔ پَل میں سردی، پَل میں گرمی۔ ابھی بارش ہے، ابھی بارش ہے، ابھی مطلع صاف ہے، ابھی گرمی میں بھُنے جا رہے ہیں اور ابھی سرد ہَوا کے جھونکے سوئٹر پہننے پر اُکسا رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو نزلہ زکام میں مبتلا دیکھا۔ کسی کے سر اور کمر میں درد تھا۔ وجہ؟

"جی ہاں، یہاں کا موسم بہت خراب ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ پَل پَل میں بدلتا ہے۔ اسی لیے بیماریاں پھیل رہی ہیں۔"

یہ وہی نپا تُلا جواب ہے جو آپ پاکستان میں بھی سُنتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ اتنے زیادہ بیمار ہو جاتے ہیں کہ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے۔ دراصل ہمارے لوگ ناقص غذا اور صحت افزا ماحول کی عدم موجودگی کے باعث جراثیم سے لڑنے کی زیادہ سکت نہیں رکھتے۔ اِس لیے معمولی بیماری کا حملہ بھی انھیں بستر پہ دراز کر دیتا ہے جب کہ یہاں کے لوگ صحت مند اور طاقت ور ہیں۔ اِس لیے چھوٹی چھوٹی بیماریاں ان کا کچھ نہیں بگاڑتیں۔ مگر حالت وہی ہے جو ہمارے ملک میں ہے۔ گرمی کے موسم میں بارشیں ہونے لگتی ہیں، برسات میں دھوپ چمکتی ہے، سردی میں گرمی ہو جاتی ہے، وہ جو کسی

زمانے میں لگے بندھے موسم ہوا کرتے تھے وہ اب کہیں بھی نہیں رہے۔ پاکستان کا احوال تو آپ خوب جانتے ہیں۔ کینیڈا اور امریکہ میں بدلتے ہوئے موسموں کے بارے میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں اور اس بار بھی یہی عالم ہے۔ ہم ٹورنٹو پہنچے تو خوب دھوپ چمک رہی تھی۔ تمازت اتنی کہ تھوڑی دیر دھوپ میں کھڑے ہو جاؤ تو چہرہ جلنے لگتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے لیے تو دھوپ نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گرمی کی شدت سے بوکھلائے ہوئے بھی رہتے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں کہ دو چار دن کی شدید گرمی کے بعد بارش ہوگی اور موسم خوشگوار ہوگا۔ سڑکوں پر، بازاروں میں، تفریح گاہوں اور باغوں میں ہر جگہ موسم گرما سے لطف اندوز ہونے والوں کی بہت بڑی تعداد ہر وقت موجود رہتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے دفتروں اور فیکٹریوں سے چھٹی لے لی ہے اور گرمی اور دھوپ میں اوندھے اور چت لیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یوں تو مغرب میں لباس خصوصاً خواتین کا لباس کچھ زیادہ ہی مختصر ہو گیا ہے مگر گرمی کے موسم میں لباس کے نام پر تہمت ہی سمجھ لیجئے۔ ہر جگہ مرد، عورت، بچے، بوڑھے برائے نام لباس میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مختصر سا نیکر اور نہایت مختصر سا بلاؤز یا بنیان نما قمیض تو بہت زیادہ لباس ہے۔ نیکر اب سمٹ کر جانگیے کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور اوپر کا حصہ بھی محض تکلف ہی سمجھ لیجئے۔ جھیلوں، باغوں اور ساحل سمندر پر یہ لباس سمٹ کر اور بھی مختصر ہو جاتا ہے۔ تصور کے لیے بھی باقی کچھ نہ رہا۔ مرد محض جانگیہ پہن کر گھومتے پھرتے ہیں۔ گرمی سے مزید لطف اندوز ہونے کی خاطر بہت سے لوگ جوتے بھی نہیں پہنتے۔ چنانچہ ننگے دھڑنگے مرد اور عورتیں ننگے پیر اگر ہر طرف گھومتے ہوئے نظر آئیں تو ماحول کیسا نظر آتا ہوگا؟ یہ اندازہ آپ خود ہی لگا سکتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ کئی دکانوں اور ریستورانوں میں اب لوگوں نے یہ لکھ کر لگا دیا ہے کہ

"اندر آنے کے لیے کچھ لباس اور جوتا پہن کر تشریف لائیں"، کچھ لباس کا مطلب

تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ بے لباس تشریف نہ لائیں۔

اِن دنوں یہاں فلمساز و ہدایت کار پرویز ملک کی فلم "کامیابی" کی فلم بندی ہو رہی ہے۔ اِس سے پہلے کینیڈا میں چند بھارتی فلمیں بن چکی ہیں۔ ایک فلم وہ بھی تھی جس میں ہمارے ندیم اور بنگلہ دیش کی ہیروئن بینا نے بھی کام کیا ہے (یہ فلم شاندار طریقے پر ناکام ہوتی ہے) "کامیابی" پہلی پاکستانی فلم ہے جس کی فلمبندی کینیڈا میں ہو رہی ہے۔ ندیم، شبنم، کمسن اداکار خرم فلمبندی میں حصہ لے رہے ہیں۔ چند مقامی ایشیائی اور کینیڈین ایکٹر اور ایکٹریسیں بھی اس فلم میں اداکاری کر رہے ہیں۔ فلم بندی کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔ موسم بھی اچھا ہے اور بیشتر وقت دھوپ چمکتی رہتی ہے۔ اِس لیے شوٹنگ کی رفتار خاصی تیز ہے۔ اب تک پرویز ملک دو گانے اور بہت سے مناظر فلما چکے ہیں۔ ٹورنٹو اور گرد و نواح کے تمام خوبصورت اور قابلِ دید مقامات پر فلمبندی کی جا رہی ہے۔ سی این ٹاور (یہ ٹاور دُنیا کا بلند ترین مینار ہے جس پر لفٹ کے ذریعہ سیاح جا سکتے ہیں) نیاگرا فالز جو دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے، جھیل کے آس پاس کے باغات نمائش گاہ، اونٹاریو پلیس (یہ ٹورنٹو میں سیاحوں اور سیر کرنے والوں کے لیے ناقابلِ فراموش جگہ ہے) اور جھیل اونٹاریو کے درمیان واقع سینٹرل آئی لینڈ ایسے مقامات ہیں جن کے بغیر کینیڈا کا تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ پرویز ملک نے ان سب مقامات پر شوٹنگ کی ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے مصروف ترین بازاروں اور شاپنگ سینٹرز میں بھی فلم بندی کی گئی ہے۔ ان ڈور شوٹنگ کے لیے مناسب اور خوبصورت مکانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ "کامیابی" پہلی پاکستانی فلم ہے جس کی بڑے وسیع پیمانے پر کینیڈا میں فلم بندی کی جا رہی ہے۔ اِس لیے مقامی پاکستانی آبادی اس میں بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے۔ اداکاروں سے ملنے والوں کا ہجوم ہر جگہ موجود رہتا ہے، اور تو اور بھارتی باشندے بھی اس فلم میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ندیم

نے جب سے بھارتی فلموں میں اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھارت والوں کے لیے بھی نا آشنا نہیں رہے۔ پھر جب سے دی سی آر پر فلمیں دیکھنے کا سلسلہ شروع ہُوا ہے بھارتی لوگ بھی پاکستانی فلموں کو ویڈیو کیسٹ پر دیکھ لیتے ہیں اور اس طرح نہ صرف پاکستانی فلموں کے معیار کا اندازہ انھیں ہو گیا ہے بلکہ وہ پاکستانی اداکاروں سے متعارف بھی ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلم بندی کے دوران شوٹنگ دیکھنے اور آٹوگراف حاصل کرنے میں پاکستانیوں کے ساتھ ساتھ بھارتی لوگ بھی نظر آتے ہیں۔

لگے روز لیک شور پر فلم بندی جاری تھی۔ پرویز ملک، خُرّم، ندیم اور شبنم پر چند مناظر فلمائے جا رہے تھے۔ دھوپ بہت اچھی نکلی ہوئی تھی جس کے سبب فلم بندی کا سلسلہ نہایت برق رفتاری سے جاری تھا۔ مگر ساحل پر تفریح کرنے والوں اور دھوپ سے لُطف اندوز ہونے والوں کا بھی جمگھٹا تھا۔ یہ موسم مقامی لوگوں کے لیے تو عید کی حیثیت رکھتا ہے مگر پرویز ملک کو دشواری یہ پیش آ رہی کہ ہر طرف اتنے ڈھیر سارے ننگے اور آدھے ننگے جسم بکھرے ہوتے نظر آتے ہیں کہ انھیں کیمرے کی آنکھ سے دُور رکھنا بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ جب ہر طرف لباس یہ ہو اور لوگوں پر بھی کوئی اختیار نہ ہو تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان جسموں کو کیمروں کی زد سے بچانا کتنا مشکل ہے۔ شوٹنگ دیکھ کر یہاں لوگ بلا وجہ گھیرا نہیں بناتے مگر دلچسپی کے اظہار کے طور پر یہ ضرور دریافت کرتے ہیں کہ کس فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے پاکستان کا نام بار بار سُننے میں آتا ہے اور کینیڈا والوں کے علاوہ دُنیا کے دوسرے حصّوں سے آتے ہوئے سیاح بھی پاکستان اور وہاں کی فلموں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے جاتے ہیں۔ مثلاً ان صاحب کو لیجیے۔ دیکھنے میں ساٹھ پینسٹھ سال کے لگتے ہیں۔ جھیل کے کنارے تولیہ بچھائے اس حُلیے میں بیٹھے ہیں کہ سر پر ہیٹ اور جسم پر ایک مختصر نیکر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سر اٹھا اٹھا کر بار بار شوٹنگ دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اپنی طرف متوجہ پایا تو فوراً گفتگو کا آغاز کر دیا۔ یہ صاحب شکستہ لہجے

میں انگریزی بولتے ہیں جو اِس بات کی علامت ہے کہ یورپ کے کسی ملک کے رہنے والے ہیں۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ پولینڈ کے رہنے والے ہیں اور انھیں کینیڈا میں آکر آباد ہوتے ۳۵ سال کا عرصہ ہو گیا۔ دو سال پہلے بیوی مر چکی ہے۔ بچّے اور بچیاں اپنے کاموں میں مصروف ہیں اِس لیے بیچارے تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم سے پاکستان کے بارے میں دریافت کرتے رہے اور جب یہ سُنا کہ وہاں خوب دھوپ ہوتی ہے تو رشک آمیز لہجے میں بولے۔

"کتنے خوش نصیب ہو تم لوگ! یہاں تو بس موسم گرما کے دو تین ماہ ہوتے ہیں، اور اس دوران میں بھی دھوپ مسلسل نہیں ملتی۔"

نام اُن کا بہت لمبا چوڑا ہے مگر مختصراً جارجی کہلاتے ہیں۔ گفتگو کے دوران مسلسل ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے اور اپنے ملک کا ذکر کرتے رہے جہاں وہ گزشتہ ۵۳ سال سے نہیں گئے ہیں مگر پولینڈ کے بارے میں لحہ لحہ کی خبر رکھتے ہیں۔ اِس بات سے یہ اندازہ کیجیے کہ انسان طبعی طور پر اپنے وطن سے کس قدر زیادہ اُنس اور لگاؤ رکھتا ہے حالانکہ معاشی طور پر وہ کینیڈا میں خوشحال اور مطمئن ہیں مگر وطن کو فراموش نہیں کر سکے۔ کہنے لگے۔

"اپنے ملک اور اپنے وطن سے زیادہ اچھا اور پیارا کوئی ملک نہیں ہوتا۔"

پھر وہ پاکستان کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ افغانستان اور روس کے بارے میں انھیں کافی تشویش تھی۔ ہم نے زمین پر نقشہ بنا کر انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ پاکستان دُنیا کے نقشے پر کس جگہ واقع ہے اور کن ممالک میں گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف چین، دوسری طرف افغانستان اور روس، تیسری طرف بھارت، چوتھی طرف ایران۔

"ویری امپارٹنٹ، ویری امپارٹنٹ۔" وہ متاثر ہو کر چلّائے۔ پھر کہنے لگے "پاکستان کو تو بہت بڑی فوج رکھنی پڑتی ہو گی۔ کیا تمھاری فوج بہت اچھی ہے"؟ پھر خود ہی بولے۔ "اچھی ہی ہو گی۔ تب ہی تو تم اتنے اطمینان سے ساری دُنیا میں گھومتے پھرتے ہو

اچھا دیکھو، تمہارا ارادہ کینیڈا میں مستقل رہنے کا تو نہیں ہے؟" ہمارے انکار پر کہنے لگے۔ "بالکل ٹھیک! ہر شخص کو اپنے ملک میں رہنا چاہیئے۔ اس کا کیا مزہ ہے یہ تم مجھ سے پوچھو اِس لیے کہ مَیں اس سے محروم ہوں۔ مَیں مکمل انسان نہیں ہوں۔ مَیں بنجارہ ہوں پناہ گزین ہوں۔ آوارہ گرد خانہ بدوش ہوں۔ ۵۳ سال یہاں رہ کر بھی اکیلا اور اجنبی ہوں یہ زمین، یہ مٹّی میری نہیں ہے۔" انھوں نے اُداس ہو کر اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور غم غلط کرنے کے لیے کوک کا ڈبہ اٹھا کر مُنہ سے لگا لیا۔ جارجی کا حُلیہ ایسا تھا کہ یونٹ کے دوسرے لوگ بھی ایک ایک کر کے ان کے گِرد اکٹھے ہو گئے۔ ہر شخص ٹوٹی پھُوٹی انگریزی ان پر آزمانے لگا۔ خود جارجی بھی انگریزی میں زیادہ رواں نہیں تھے اِس لیے ہم لوگوں کی انگریزی پر حیران نظر آ رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ اتنی اچھّی انگریزی تم نے کہاں سے سیکھی؟

کامیابی کا موضوع بھی کینیڈا میں رہنے والے پاکستانی ہی ہیں اور پرویز ملک نے اِس فلم کے ذریعہ یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح ہر درخت، ہر پودے اور ہر پھل کو بارآور ہونے کے لیے ایک خاص مٹّی اور ایک خاص موسم کی ضرورت ہوتی ہے اِسی طرح ہر انسان کے لیے بھی مخصوص مٹّی، موسم اور ماحول ضروری ہے۔

روزگار کے لیے چاہے انسان ساری دُنیا میں کہیں بھی گھومتا پھرے مگر اس کی آخری منزل اس کا اپنا ملک اور وطن ہونا چاہیئے، جو لوگ اپنی محنت اور صلاحیت سے دوسرے ملکوں کو گل و گلزار بنا سکتے ہیں ان کی اوّلین توجہ کا مستحق خود ان کا اپنا ملک ہونا چاہیئے۔ سچ پوچھئے تو یہی پیغام جارجی نے بھی اپنی ٹوٹی پھُوٹی انگریزی کے ذریعہ ہم تک پہنچایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ پرویز ملک کو یہ پیغام پہنچانے کے لیے کئی ماہ کی کاوش اور لاکھوں روپے کا سرمایہ درکار ہوگا جبکہ جارجی نے ایک کوک پیش کر کے یہ فرض اَدا کر دیا۔

ٹی وی اور وی سی آر نے ہر جگہ فلمی صنعت کو متاثّر کیا ہے اور نقصان پہنچایا ہے

مگر امریکہ اور کینیڈا میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اس موسم گرما میں فلمیں بہت اچھا بزنس کر رہی ہیں اور بعض فلموں نے تو آمدنی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ہر فہرست سُپرمین تھری، ریٹرن آف جیڈی، ٹریڈنگ پلیس، سائیکو ٹو، دار گیمز اور دی مین دو ٹو برنیز ہیں۔ جیمز بونڈ کی نئی فلم "آکٹوپسی" بھی آمدنی کے اعتبار سے ایک کامیاب فلم ہے۔ اوّل الذکر پانچ فلمیں سائنس فکشن ہیں۔ سائیکو ایک اعتبار سے الفرڈ ہچکاک کی مشہور فلم سائیکو کا دوسرا حصّہ ہے۔ دی مین دو ٹو برنیز مزاحیہ فلم ہے جبکہ آکٹوپسی جیمز بونڈ کی گزشتہ فلموں کی طرح چوں چوں کا مربّہ اور کمرشل فلم ہے۔ یہ جیمز بونڈ سلسلے کی تیرھویں فلم ہے اور سب سے کامیاب فلم بھی ہے۔ اِس فلم نے شمالی امریکہ کے تیرہ سو گیارہ سینماؤں میں پہلے تین دن میں تقریباً نوّے لاکھ ڈالرز کا گراس کیا ہے۔ اِس سے فلم کی تجارتی کامیابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "ریٹرن آف جیڈی" نے ابتدائی ۱۹ دنوں میں امریکہ اور کینیڈا میں ۹۲ ملین ڈالرز کا بزنس کیا ہے اور خیال ہے کہ یہ آمدنی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کرے گی۔ ٹریڈنگ پلیس نے ابتدائی تین دن میں تقریباً سترہ ملین یعنی ایک کروڑ ستر لاکھ ڈالرز کمائے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس فلم پر صرف چالیس لاکھ ڈالرز لاگت آئی ہے۔ جبکہ اس کے ابتدائی دنوں کی آمدنی چار گنا ہے۔ دار گیمز بھی ایک سائنس فکشن ہے جس کی کہانی یہ ہے کہ دو بچّے کھیل کھیل میں کمپیوٹرز کے کھیل کے ذریعہ عالمگیر جنگ کے آغاز کا سبب بن جاتے ہیں۔ اِس فلم کے بارے میں قیاس یہ تھا کہ یہ کامیابی کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈز توڑ دے گی مگر اس نے ابتدائی دس روز میں ۸۴۳۔ سینما گھروں میں ایک کروڑ ۶۷ لاکھ ڈالرز کا بزنس کیا ہے جو بہت اچھا ہے مگر غیر معمولی نہیں کہا جا سکتا۔ امریکہ اور کینیڈا میں گرمی یا بہار کا موسم فلموں کے لیے بہترین موسم سمجھا جاتا ہے۔ ان ہی مہینوں میں زیادہ تر فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہیں اور زیادہ تر بزنس بھی انہی دنوں ہوتا ہے۔ گرمی کے موسم میں یہاں کے لوگ دیوانے ہو کر گھروں سے باہر کا

رُخ کرتے ہیں۔ سیر گاہوں، تفریح گاہوں، باغات، ساحلی مقامات پر لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں میں سینما گھروں پر لوگوں کی یلغار ہوتی ہے اور فلمیں خوب کماتی ہیں۔ مگر سائنس فکشن قسم کی فلمیں پاکستان میں زیادہ کامیابی اور مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ مذکورہ بالا فلموں کو بھی پاکستان کے عوام زیادہ پسند نہیں کریں گے۔ البتہ جیمز بونڈ کی فلم "آکٹوپسی" خاصی کامیابی حاصل کرے گی لیکن سنسر کی قینچی سے بھی نہیں بچ سکے۔ اس فلم کے تو ٹائیٹلز ہی بمشکل ہمارے سنسر بورڈ کی منظوری حاصل کر سکیں گے۔ فلم کے بعض مناظر میں بھی خاصی عریانی ہے مگر مجموعی طور پر یہ غالباً جیمز بونڈ کے سلسلے کی سب سے دلچسپ اور ہیجان خیز فلم ہے۔ اس فلم کے بہت سے مناظر کی فلم بندی بھارت میں کی گئی ہے۔ بھارتی اداکار کبیر بیدی نے اس فلم میں خاصا اہم کردار بھی ادا کیا ہے۔ دو تین اور بھارتی اداکار بھی اس کی کاسٹ میں شامل ہیں۔ جن میں ایک امرجیت بھی ہیں۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے کروڑ پتی باپ نے اس فلم کی سرمایہ کاری میں بھی حصہ لیا ہے۔ گزشتہ چند ماہ میں یہ دوسری بڑی فلم ہے جس میں بھارت کا ذکر ہے اور جس کے حوالے سے بھارت کو خاصی پبلسٹی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے پہلے "گاندھی" نے یورپ اور امریکہ میں خوب دھومیں مچائی ہیں۔ اس فلم کی مقبولیت اور کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ٹورنٹو کے بعض سینما گھروں میں یہ مسلسل چوبیس پچیس ہفتوں سے دکھائی جا رہی ہے اور بہت سے سینماؤں میں ابھی تک ہاؤس فل جا رہے ہیں۔ ان دونوں فلموں نے بھارت کی بہت اچھی پبلسٹی کی ہے اور لاکھوں سیاحوں نے بھی یہ فلمیں دیکھنے کے بعد بھارت کا رُخ کیا ہے۔ جہاں وہ لاکھوں ڈالرز کا زرمبادلہ خرچ کریں گے۔

کینیڈا میں ہندوستانیوں کی آبادی بہت پرانی ہے اور کافی تعداد میں بھارتی یہاں موجود ہیں جن میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی ہے لیکن ایک اندازے کے مطابق امریکہ اور

کینیڈا میں سکھوں کی تعداد بھی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے جس میں سے ڈیڑھ لاکھ سکھ کینیڈا میں آباد ہیں۔ سکھوں میں بھی اب جدید تہذیب کی برکتوں کے باعث "مونا" بننے کا رواج عام ہو رہا ہے اس کے باوجود آپ سڑکوں پر دوکانوں میں اور کام کاج کی جگہوں پر سکھوں کو اپنے قدیم لباس اور ڈاڑھی، مونچھ، چوٹی اور پگڑی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ سکھوں میں بھارت سے علیحدگی کا رجحان اب بہت عام ہو رہا ہے۔ اور ان میں یہ احساس شدت سے پیدا ہو گیا ہے کہ اگر بھارتی حکومت کی موجودہ پالیسی قائم رہی تو سکھوں کو اپنی علیحدہ حیثیت برقرار رکھنی مشکل ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ . . . . . "خالصتان" کی تحریک انگلستان اور شمالی امریکہ میں زیادہ پُرجوش ہے۔

پچھلے دنوں ٹورنٹو کے مشہور روزنامہ "گلوب اینڈ میل" نے خبر دی ہے کہ کینیڈا اور امریکہ کے سکھوں نے "خالصتان" تحریک کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دی ہیں۔ انھوں نے جلاوطنی میں ایک "خالصتان" قائم کر لیا ہے اس کا ایک صدر دفتر لندن میں ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں انھوں نے اپنا قونصل خانہ قائم کر لیا ہے۔ اپنے ڈاک کے ٹکٹ شائع کیے ہیں اور اپنے پاسپورٹ بھی جاری کر رہے ہیں (اگرچہ ان کی سرکاری حیثیت ابھی کچھ نہیں ہے) "خالصتان" کے حامی اس کوشش میں ہیں کہ اقوام متحدہ سے "خالصتان" کو اسی طرح تسلیم کرا لیا جائے جس طرح اقوام متحدہ نے فلسطینیوں کی تحریکِ آزادی کو تسلیم کر لیا ہے۔

خالصتان تحریک کے لیے سرمائے کی کمی نہیں ہے۔ یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں آباد سکھ کافی خوشحال ہیں۔ تحریک کے داعیوں کا کہنا ہے کہ کینیڈا میں ان کے عملی ارکان کی تعداد دس ہزار سے زاید ہے جن میں سے ہر شخص ماہانہ دس ڈالر چندہ ادا کرتا ہے۔ اس طرح ہر سال تقریباً بارہ لاکھ ڈالر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ چندے اور عطیات اس کے علاوہ ہیں۔ خالصتان کے حامیوں کا کہنا ہے کہ وہ نہ صرف سکھوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست

چاہتے ہیں بلکہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک غیر جانبدار ریاست کے خواہاں ہیں۔ وہ روس کے بھی مخالف ہیں جو بقول ان کے موجودہ بھارتی حکومت کا ممدوح ہے۔

کینیڈا دُنیا کے خوشحال ترین ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ صنعتی اور سائنسی ترقی کے اعتبار سے اسے امریکہ کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بے اندازہ زمینیں ابھی تک آباد نہیں ہوتی ہیں۔ بے حساب معدنیات کو ابھی تک ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا ہے۔ ملک بہت وسیع و عریض ہے جبکہ آبادی بہت کم ہے۔ لیکن معاشی بدحالی کی شکایت یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ بیروزگاری بھی بڑھ رہی ہے۔ گرانی میں گزشتہ دو سالوں میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ لوگ چلّا اُٹھے۔ لوگوں کی آمدنی بھی بڑھی ہے مگر گرانی کے حساب سے نہیں یہی وجہ ہے کہ آئے دن یہاں صنعتی مسائل کی وجہ سے ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں۔ گزشتہ دنوں ڈاک والوں نے ہڑتال کی تھی جو ۳۹ دن جاری رہی۔ بڑے صنعتی اور کاروباری ادارے تو ڈاک پر انحصار نہیں کرتے مگر چھوٹے بڑے کاروبار بہت متاثر ہوتے۔ کئی تو تباہ ہو گئے ہیں۔ اِس کے بعد پولیس والوں نے ہڑتال کا نوٹس دے دیا۔ بس والوں نے بھی ہڑتال کر دی تھی جو خدا خدا کر کے ٹلی ہے۔ کینیڈا کی صنعت و حرفت پر امریکہ کی گرفت ہے۔ سرمایہ بیشتر امریکہ سے آیا ہے اگرچہ اب کینیڈا کے بڑے ادارے بھی امریکہ میں صنعتیں خریدنے لگے ہیں جس پر امریکہ والوں نے بہت شور مچا رکھا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق امریکی کمپنیاں اِس سال کینیڈا میں ساڑھے پانچ ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کریں گی۔

دُنیا کی دوسری حکومتوں کی طرح کینیڈا کی وفاقی حکومت بھی اپنے وسائل سے کہیں زیادہ مسائل کا شکار ہے اور قرضوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے۔ سرکاری قرضوں کی رقم جو ۱۹۷۴ء میں ۲۱ ارب ڈالر تھی۔ اب ۱۹۸۱ء میں ۸۳ ارب ڈالر ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حکومت قرضے اَدا کرنے لگے تو کینیڈا کے ہر مرد، عورت اور بچّے کو اس سال ۳۲۴۳ ڈالر مزید ٹیکس اَدا کرنا ہوگا۔ تب جا کر یہ قرضہ ادا ہو گا جبکہ

۱۹۷۴ء میں کینیڈا کا ہر شہری ۱۹۵۰ ڈالر کا قرضدار تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کو جو آمدنی ہوتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ اخراجات کرتی ہے اور اس طرح آئندہ نسلوں پر قرضوں کا بوجھ بڑھا رہی ہے۔ سال رواں میں بھی کینیڈا کی حکومت تقریباً ۱۲ ارب ڈالر خسارے کا بجٹ پیش کرے گی۔ پہلے اندازہ تھا کہ خسارہ ساڑھے ۱۳ ارب ڈالر ہوگا۔ مگر اب یہ گھٹ کر محض بارہ ارب ڈالر رہ گیا ہے (اس کے مقابلے میں امریکہ میں کارٹر انتظامیہ نے خسارے کا جو اندازہ لگایا تھا۔ موجودہ امریکی حکومت کے مطابق اس میں ۵۰ فیصد اضافہ ہو گیا ہے) اخبارات اور اقتصادی ماہرین الزام لگا رہے ہیں کہ لبرل حکومت نے برسر اقتدار رہنے کی کوشش میں خوب اللّے تللّے کئے اور لوگوں کو خوش کرنے کے لیے سرکاری خزانہ پر ناواجب بوجھ ڈال دیا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر حکومت نے یہ قرضہ ابھی اَدا نہیں کیا تو بعد کو اس میں سود کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔

ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بینکوں کی سود کی شرح ۱۶٫۸۷ یعنی ۲۲ فیصد کے قریب ہے۔ جو کہ حد سے زیادہ ہے۔ کئی ادارے اِس کی وجہ سے دیوالیہ ہو گئے ہیں اور عام لوگ جو عموماً بینکوں سے قرضہ حاصل کر کے مکانات وغیرہ خریدتے ہیں۔ اب یہ بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں رہے۔

یوں تو کینیڈا میں اشیاء کی قیمتیں تقریباً امریکہ کے لگ بھگ ہی ہیں بلکہ بعض اشیاء امریکہ کے مقابلے میں کچھ گراں ہیں لیکن یہاں پٹرول امریکہ کے مقابلے میں سستا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مقامی لوگ تفریح کے لیے جاتے ہیں تو عموماً کاریں استعمال کرتے ہیں۔ گزشتہ مہینوں میں پتہ چلا کہ کینیڈا میں سیاحوں کی آمد میں اچانک اضافہ ہو گیا ہے خصوصاً امریکہ سے آنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ امریکی سیاحوں کی اکثریت محض سرحد عبور کر کے گیس (پٹرول) خریدنے کے لیے آتی تھی۔ امریکہ اور کینیڈا کے مابین آمد و رفت پر (دونوں ملکوں کے شہریوں کے لیے) خاص پابندی نہیں ہے وہ

محض اپنا شہریت کارڈ دکھا کر سرحد عبور کر سکتے ہیں۔

کینیڈا کے لبرل وزیر اعظم مسٹر ٹروڈو کی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف یہاں خاصی ناراضگی پیدا ہو چلی ہے۔ رائے عامہ کی ناپسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ہفتے دو حلقوں کے ضمنی انتخابات میں وزیر اعظم کی جماعت کے امیدواروں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ عام لوگوں کی شکایت ہے کہ حکومت کو عوام کی ضرورتوں اور سہولتوں کا احساس نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ وزیر اعظم ٹروڈو کی حکومت ایک کمزور اور نرم حکومت ہے کسی مسئلے کے بارے میں سخت قدم نہیں اٹھا سکتی۔ ملک کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ ڈاک خانہ والوں نے ۳۹ دن تک ہڑتال جاری رکھی اور پھر جب ہڑتال ختم ہوئی حکومت نے ان کے مطالبات قریب قریب مان لیے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ پھر ۳۹ دن تک ہڑتال جاری رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ریلوے کا عملہ ہڑتال کے لیے پر تول رہا ہے۔ محکمۂ بجلی کے ملازمین ہڑتال کی دھمکی دے رہے ہیں۔ کینیڈا کے ڈالر کی قیمت گرتی جا رہی ہے۔ بینک کی شرح آسمان تک پہنچ گئی ہے جس کی وجہ سے کاروبار اور عوام مشکلات سے دوچار ہیں۔ جب کینیڈا میں ڈاک کی ہڑتال تھی اس وقت وزیر اعظم افریقہ کا دورہ کر رہے تھے۔ ملک کے اکثر وزرا۔ دارالحکومت سے باہر تھے۔ وزیر مالیات میکسیکو میں چھٹی منا رہے تھے۔ پوسٹ ماسٹر جنرل مونٹریال میں پائے گئے۔ اس مشکل وقت میں دارالحکومت میں صرف ایک وزیر موجود تھا اور وہ تھے وزیر مواصلات۔ جب سے امریکی صدر ریگن "مرد آہن" کی پالیسی پر گامزن ہوتے ہیں (ایئر کنٹرولرز کی ہڑتال کے متعلق انھوں نے بہت سخت رویہ اختیار کیا ہے۔) کینیڈا کے عوام کو یہ احساس اور شدید ہو گیا ہے کہ ان کی حکومت مسائل سے نمٹنے کے مسئلے میں بہت کمزور اور نرم دل ہے۔ بہت ممکن ہے آئندہ انتخابات میں وزیر اعظم ٹروڈو اور ان کی جماعت کو اقتدار سے محروم ہونا پڑے۔ آثار یہی بتا رہے ہیں۔

مغربی ممالک خصوصاً (امریکہ اور کینیڈا) میں سرجری اور سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے اس کا ثبوت ایک تازہ ترین خبر ہے جس میں ڈاکٹروں نے ایک پانچ سالہ لڑکی کا کٹا ہوا ہاتھ دوبارہ اس کے جسم سے جوڑ دیا ہے۔ دو سال قبل پانچ سالہ برنیڈا ہیبر کا ہاتھ مشین میں آ کر کٹ گیا تھا اس کے ماں باپ نے ایک عقل مندی تو یہ کی کہ کٹے ہوئے ہاتھ کو احتیاط سے سمیٹ لیا اور دوسری عقلمندی یہ کی کہ فوراً قریبی ہسپتال پہنچے۔ ٹورنٹو کے بچوں کے ہسپتال میں ماہرین نے بازو کے پاس سے کٹا ہوا یہ ہاتھ دوبارہ لڑکی کے جسم سے پیوست کر دیا۔ یہ آپریشن تقریباً ۷ گھنٹے جاری رہا کیونکہ ہاتھ کے تمام رگ و ریشوں کو دوبارہ جوڑ دینا ایک نہایت مشکل کام تھا۔ تمام رگوں اور شریانوں کو جوڑنے کے بعد ڈاکٹروں نے برنیڈا کی کمر پر سے کھال کے دو ٹکڑے نکالے اور اس کے ہاتھ پر لگا دیئے۔

اس سے پہلے اس قسم کے دو اور آپریشن کیے گئے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی اتنا کامیاب ثابت نہیں ہوا تھا۔ برنیڈا کا بازو نہایت خوش اسلوبی سے کام کرنے لگا لیکن برنیڈا کو یہ شکایت تھی کہ اس کی کلائی دیکھنے میں بہت بری لگتی ہے۔ چونکہ ہڈی کا ایک ٹکڑا کلائی میں ابھر آیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے دوبارہ برنیڈا کا آپریشن کیا اور اس کا بازو معمول کے مطابق ہو گیا۔ یہ ایک انقلاب آفرین کامیابی ہے اور خیال ہے کہ اس تجربے کی کامیابی نے مہمات کے لیے راستہ ہموار کر دیا ہے۔

ان دنوں مونٹریال میں فلموں کا میلہ ہو رہا ہے جن میں کینیڈا کی طرف سے سرکاری طور پر جو فلم نمائش کے لیے پیش کی جا رہی ہے، اس کا نام ہے "کنگ اینڈ ڈیپریٹ مین" اس میں وزیر اعظم ٹروڈو کی سابق بیوی مارگریٹ نے بھی ایک مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ ۷ ماہ تک ہوتی اور تین سال تک اس کی ایڈیٹنگ جاری رہی۔ مارگریٹ جو ایک پیشہ ور فوٹو گرافر ہیں، اپنے شوہر سے بے وفائی کر کے کسی اور کے ساتھ رہتی ہیں، اور یہ اسکینڈل کافی عرصہ تک اخبارات کی زینت بنا رہا ہے۔ فلم کی نمائش کے بعد

پتہ چلا کہ نہ صرف فلم فضول ہے بلکہ اس میں مارگریٹ کا کردار بھی نہایت مختصر اور بے معنی ہے، بہت سے نقادوں نے تو اس بات پر بھی اعتراض کیا ہے کہ اس فلم کو نمائش میں شریک ہی کسی بنیاد پر کیا گیا ہے؟

فلم کی نمائش کے بعد پتہ چلا کہ مارگریٹ کا اداکارہ بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا، اگرچہ فلمی میلے میں ان کی شخصیت سب سے زیادہ مرکزِ نگاہ بنی ہوتی تھی۔ اٹلی کی مشہور اداکارہ جینا لولو بریجیڈا بھی مونٹریال کے فلمی میلے میں تشریف لاتی ہیں اور جیوری کی ایک ممبر بھی ہیں مگر انھیں صحافیوں اور عام لوگوں نے ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ جینا لولو بریجیڈا نے اپنی تمام زندگی میں جن فلموں میں بہترین اداکاری کی ہے، ان کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی مُل براٹنز کے سر کے بالوں کی تعداد ہے یعنی ایک بھی نہیں۔

رُوحانیت کی تلاش میں!

مغرب میں ہندو مذہب کو "روحانیت" کا علمبردار خیال کیا جاتا ہے۔ بھارت کی حکومت نے بے شمار دستاویزی فلموں اور کتابوں کے ذریعے ان کے دماغوں میں یہ بات ڈالی ہے کہ اگر سکون اور روحانیت کی تلاش ہے تو یہ چیز صرف "ہندو مذہب" میں ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ چند سال قبل یورپ اور امریکہ میں "ہندو مت" کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور جگہ جگہ مذہبی فرقے قائم ہو گئے۔ "ہرے کرشنا" تحریک بھی اسی کا نتیجہ ہے جسے شروع شروع میں انتہائی فروغ حاصل ہوا۔ یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جگہ جگہ "ہرے کرشنا" کے پجاریوں کی ٹولیاں بھجن گاتی ہوتی نظر آتی تھیں اور یہ تمام تر یوروپین اور سفید فام لڑکے اور لڑکیوں پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ "ہرے کرشنا" کے مندر ہر ملک میں قائم ہیں۔ چنانچہ مانٹریال کینیڈا میں بھی ان کا بہت بڑا گڑھ ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کینیڈا کے ایک فلم ڈائریکٹر نے "ہرے کرشنا" کے دفتر سے رابطہ قائم کیا اور ان کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانے کی خواہش ظاہر کی، ان لوگوں نے پہلے تو انکار کیا مگر بعد میں "تعاون" پر آمادہ ہو گئے۔ مگر انھوں نے ہدایت کار بلیس سے یہ وعدہ لے لیا کہ فلم دیکھنے کے بعد انھیں جو "غلط بیانیاں" نظر آئیں گی انھیں حذف کر دیا جائے گا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی اور کینیڈا کے نیشنل فلم بورڈ کے تعاون سے فرانسیسی زبان میں یہ دستاویزی فلم تیار کی

گئی جس کے نام کا ترجمہ ہے "پیرو" THE FOLLOWERS۔ ہدایت کار بلیس نے جو فلم بنائی وہ ۱۵ گھنٹے کی تھی مگر بعد میں اسے کم کرکے ۸۰ منٹ کا کر دیا گیا۔ فلم کی زیادہ تر شوٹنگ نیویارک اور اس کے گرد و نواح میں ہوتی۔ اب اس کو انگریزی زبان میں منتقل کر دیا گیا ہے" ہرے کرشنا" کے داعیوں کا کہنا ہے کہ ان کی تحریک پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ اس فلم میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں تین آدمیوں نے اس تحریک کی بنیاد ڈالی۔ جن میں سے دو ۱۹ سالہ لڑکے تھے اور ایک بیس سالہ لڑکی۔ یہ تینوں متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور تعلیم یافتہ تھے۔

ہدایت کار نے یہ فلم یہ جاننے کے لیے بنائی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں جنھیں دُنیا کی تمام آسائشیں حاصل ہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر" ہرے کرشنا" تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ فلم بنانے کے دوران ۴۰ سالہ ہدایت کار بلیس کو اس تحریک کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا اسکی ذاتی رائے یہ ہے کہ مغرب کے نوجوان اس قسم کی روحانی تحریکوں میں اس لیے شامل ہو رہے ہیں کہ وہ اپنے معاشرے سے بیزار ہیں۔ وہ اپنے معاشرے سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ اس میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ وہ اخلاقی قدروں کو دوبارہ اپنی زندگیوں میں داخل کرنے کے خواہش مند ہیں۔

جب بلیس نے یہ فلم مکمل کرنے کے بعد ہرے کرشنا تحریک کے منتظمین کے سامنے پیش کی تو انھوں نے بعض چیزوں سے اختلاف ظاہر کیا مگر کوئی چیز فلم سے نکالنے کا مطالبہ نہیں کیا، ان کا کہنا ہے کہ یہ فلم بھگوت گیتا کے ہدایات کے مطابق ہی بنائی گئی ہے ان لوگوں نے جن چیزوں سے اختلاف کیا ان پر بھی کسی ناراضگی یا غصّے کا اظہار نہیں کیا۔

یہ فلم ہرے کرشنا کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتی ہے، اس میں دکھایا گیا ہے جب تحریک کے حامی چندہ جمع کرنے نکلتے ہیں تو اپنے ہندوانے لباس تبدیل کرکے مغربی لباس پہن لیتے ہیں اور مُنڈے ہُوئے سروں وِگ لگا لیتے ہیں یہ لوگ تصویریں وغیرہ

بھی فروخت کرکے چندہ جمع کرتے ہیں، اندازہ ہے کہ یہ چندے میں خاصی وصول کرتے جو عورتیں اس تحریک میں شامل ہوتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ عورت کا فرض ہے کہ وہ شوہر کی وفادار رہے، اس کی فرمانبرداری کرے، گھر صاف رکھے اور ہر حکم کی تعمیل کرے۔ اس فلم کی نمائش کے بعد یہ بحث شروع ہو گئی ہے کہ ان نفسیاتی عوامل کو کیونکر دُور کیا جا سکتا ہے جن کی وجہ سے مغرب کے نوجوان" مشرقی پناہ گاہیں" تلاش کرنے پر مجبور ہیں۔

ہرے کرشنا تحریک کے پیشوا گوپال کرشنا سوامی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس فلم کی نمائش کے بعد ان کی تحریک کو مزید تقویت ملے گی۔ مگر کچھ عرصہ سے امریکہ اور کینیڈا میں اس تحریک کے بارے میں اس قسم کی خبریں بھی شائع ہوتی ہیں کہ اس کے دفاتر قانون شکنی کے اڈّے بنتے جا رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں ٹورنٹو میں ہرے کرشنا مندر میں چھاپہ مار کر پولیس نے کچھ اسلحہ برآمد کیا تھا۔ اس سے پہلے کیلی فورنیا (امریکہ) اور مغربی ورجینیا کے مندروں کے بارے میں بھی رقوم کی خورد برد اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزامات عائد کیے گئے تھے اور پولیس نے اس سلسلے میں ضروری کارروائی بھی کی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن تین نوجوانوں نے اس فلم میں کام کیا ہے ان میں سے دو نوجوان اب اس تحریک سے علیٰحدہ ہو گئے ہیں۔ ایک لڑکا تو مندر کے پروہت سے لڑائی کے بعد تحریک سے الگ ہو گیا۔ اور دوسری نوجوان لڑکی نے خرابی صحت کی بنا پر تحریک سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ خرابی صحت کی بنا پر اپنے مذہب کو چھوڑ دینے کی کیا تُک ہے؟

بہرحال، مغرب کے معاشرے میں مادیت پرستی سے بیزاری کا رجحان پیدا ہو رہا ہے اور بے سکونی کی وجہ سے لوگ، خصوصاً نوجوان روحانیت اور سکون کی تلاش میں جو تجربات کر رہے ہیں دیکھا جائے تو ان سب چیزوں کا مثبت اور واضح حل" اسلام" ہے۔ مگر بدقسمتی سے اسلام کے بارے میں یا تو توڑ مروڑ کر حقائق

پیش کیے جاتے ہیں یا پھر وقتاً فوقتاً اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جو خبریں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں اور دُنیا کے مسلمانوں کے کردار اور عمل کو دیکھ کر مغرب کے باشندے جو اندازے قائم کرتے ہیں اس کی وجہ سے اسلام صحیح طور پر روشناس نہیں کرایا جاسکا۔ پھر اِس قسم کی کوئی تنظیم اور مؤثر تحریک بھی موجود نہیں ہے جو عام لوگوں کو تبلیغ کے ذریعے اسلام کی طرف مائل کر سکے۔

قائد اعظم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام